www.shibliinternational.com

Dec:2020:دسمبر

ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

جمہوریت میں
آمریت، فسطائیت اور فرقہ پرستی
نہیں ہے

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد حامد ہلال اعظمی

20/- روپے

ORANGE GATE
PROPERTIES

Rs.
5499/-
Per Sq. Yd.

Orange Gate
Fortune Farm
@Shankarpalli

PRINCE DEVELOPERS
Walk into Nature

Office Address
#10-3-304/D, Bepin Nivas, Humayun Nagar, Masab Tank, Hyderabad (D)

Site Address
101 (P), 104 (P), Vattimeenapally (V), Nawabpet (M), Vikarabad (D)

8317692718
9392533661

NEW GAZALA SAREES
All kinds of Wedding Sarees, Suits & Sharara
+91 9848668219, 8686978846
#23-2-241, Volta Hotel Lane, New Moghalpura, Hyderabad, T.S.

KGN TEA SALES WHOLESALE & RETAIL
ABDUL WAHED
PROPRIETOR
Cell: 98480 36940
For Orders : 90302 02018
86396 32178
89197 03547
PREMIUM TEA
KGN
TEA SALES
WHOLESALE & RETAIL TEA MERCHANT
S.No.: 22-1-114, Jambagh, Kali Khabar Main Road, Darushifa, Hyderabad - 500 024, TS
Off.: 5-3-989, 104, First Floor, Sherza Estates, N.S. Road, M.J. Market, Hyderabad - 500 095
email: kgnteasales@gmail.com

Shoe world
STYLISH & QUALITY FOOT WEAR
Estd. 1983
SHOE WORLD CIRCLE
Pathergatti, Hyderabad. Ph.: 040 24576852
SHOE WORLD
Abids, Hyderabad, Ph.: 040 24608208

M. HILAL COLLECTION
Wholesale & Retail
Spl. in:
Lucknavi Chicken Suits,
Kurta Pyjamas,
Readymade Suits,
Nighties, Tops
& Cotton Suits Etc.
#23-6-178/1, Masjid Faqurunissa Begum,
Mir Momin Daira, Hari Bowli, Hyderabad.
9032675243, 8919620790, 9392533661

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

Dec:2020:دسمبر

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216
Rs. 20/-

مجتبیٰ ٹکسٹائلس

MUJTABA
TEXTILES

#20-4-20/6/1, 20-4-20/7/5 & 7/6, Punch Mohalla, New Laad Bazar, Khilwath, Hyderabad. T.S. India
Ph: +91 6281040896 - Email: mujtabatextiles18@gmail.com - Web: www.mujtabatextiles.com
Follow us on facebook: https://www.facebook.com/mujtaba.textiles.1

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com

Issue:34 شمارہ۔ Vol:3 جلد

Dec :2020 دسمبر

ماہنامہ

حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی ، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشادالحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال، ڈاکٹر ناظم علی، ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، مولانا عبدالوحید ندوی، مولانا احمد نور عینی، ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

SADA E SHIBLI
A/c: 13271024000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

قیمت فی شمارہ: 20 سالانہ: 220
رجسٹرڈ ڈاک: 350- بیرونی ممالک: 50/ امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

Email: sadaeshibli@gmail.com

خط وکتابت کا پتہ

Mob: 9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli,Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط: (۳۱)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۰
۵	حیوانات کے حقوق اور احکام	مفتی امانت علی قاسمی	۱۲
۶	غزل	رحمٰن جامیؔ	۱۵
۷	حضورِ اکرمؐ کے اخلاق پوری انسانیت کے لیے نمونہ ہے	ڈاکٹر مفتیہ رقیہ شکیل خان	۱۶
۸	سیکولر اور فرقہ پرستوں کا اختلاف اور مسلم قیادت: اہمیت وضرورت	محمد زاہد ناصری القاسمی	۱۹
۹	جیلانی بانو کے ناولوں میں مسائلِ نسواں کی بازگشت	رشدہ شاہین	۲۲
۱۰	دکن میں فارسی زبان میں تاریخ نویسی اور مورخ کے خصوصیات	محمد عبدالمعید	۲۸
۱۱	اردو نعت گوئی میں مولانا احمد رضا خاں کا مقام	صدام حسین	۳۲
۱۲	ایک لڑکی تنہا سی (نظم)	قیّوم خالد	۳۶
۱۳	سیاست اور طلبا	شمیم مشتاق	۳۷
۱۴	تقدیر میں ہو تو... (آخری قسط)	سیدہ زہرا جبین	۳۹

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلیج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلیج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

ماہِ دسمبر ۲۰۲۰ء اختتامی مرحلے میں ہے۔ جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو نیا سال شروع ہو چکا ہوگا۔ مارچ ۲۰۲۰ء سے اب تک ہم کرونا کی ہیبت سے باہر نہیں نکل پائے ہیں کہ عالمی اور ملکی پالیسی نت نئے طریقے سے تبدیل ہو رہی ہے۔ مزدور، غریب، تاجر، پرائیوٹ ملازمین بے حد پریشان ہیں۔ اس سے کس طرح نکلا جائے، سمجھ سے بالاتر محسوس ہوتا ہے۔ شمس جالنوی کے ؎

حالات سے سمجھوتہ ہم روز ہی کرتے ہیں
ایک زخم نہیں بھرتا کہ سو زخم ابھرتے ہیں

بہر حال دنیا کے انسانوں کو دنیا کے ظالموں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ دنیا کا پیدا کرنے والا بہت طاقت ور اور مخلوق پر رحم کرنے والا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم رجوع الی اللہ ہوں اور مخلوقِ خدا سے نفع رسانی کا معاملہ کریں، قوم اور اپنا احتساب کریں۔

کسان ہمارے ملک کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ گذشتہ ایک چلّے سے یعنی چالیس روز سے شمالی ہند کی سخت سردی میں سڑک پر احتجاج کر رہے ہیں اور حکومت سے اپنے حقوق اور نئے قانون کی واپسی کی مانگ کر رہے ہیں اور یہ کہہ رہے ہیں کہ پرانے طریقے میں عمدہ بہتری کیجئے، جو کسانوں کے حق میں بہتر ہو جبکہ حکومت کے کارندے اور نمائندے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ نیا قانون کسان کے حق میں مفید ہے، لیکن جب کسانوں کے لیڈران ان سے یہ پوچھتے ہیں کہ کیسے؟ تو ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کیوں کہ داخلی، خارجی، عملی دلائل وشواہد حکومت کے پاس نہیں ہیں۔ اس وجہ سے احتجاج رکنے اور بات بنتے ہوئے نہیں دکھائی دے رہی ہے۔ ضد سے راستہ نہیں نکلتا ہے بلکہ درگزر، دل کے بڑا کرنے اور نظر انداز کرنے سے راستہ نکلتا ہے۔

بنگال میں چند ماہ کے بعد الیکشن ہے۔ اس کا غلغلہ پورے شباب پر ہے۔ سیاستدانوں سے زیادہ ہمارے ملک کے نیشنل چینل بھرپور طریقے سے بنگال کی سیاست میں لگے ہوئے ہیں۔ ملک میں جو دوسرے اہم کام ہیں، کسانوں کا احتجاج، پرائیوٹ ٹیچروں کی بحالی اور حکومت کی کمزوری انہیں نہیں دکھائی دے رہی ہے، بس الیکشن میں بنگال کی موجودہ حکومت کو کیسے مات دے دی جائے، اس کے نئے نئے حربے بتانے اور دکھانے میں لگی ہوئی ہے۔ میڈیا کو اس سے باز آنا چاہئے، مقدس صحافت کے دامن کو داغ دار نہیں کرنا چاہئے کیوں کہ میڈیا ملک کا چوتھا ستون ہے اگر ستون ہل جائے تو ساری عمارتیں ہچکولے لینے لگے گیں۔

پدم شری اردو زبان وادب کے مشہور شاعر، ادیب، نقاد شمس الرحمان فاروقی ۲۵ر دسمبر کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ فاروقی صاحب نے پروقار زندگی گزاری، انہوں نے اپنی فکر کو دلائل سے ثابت کیا۔ عام ادیبوں سے ہٹ کر ان میں خودداری، بے باکی، حق گوئی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ مغفرت فرمائے، جنت الفردوس نصیب کرے، پسماندگان، متعلقین، لواحقین کو صبر جمیل دے۔ آمین۔ ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد فاروقی صاحب کی علمی وادبی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے۔ ان کے علمی وادبی کارنامے ان کو پسِ مرگ زندہ ہونے کی یاد دلاتے رہیں گے۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

گداگری اور سوال سے نفرت:

باوجود اس کے کہ آپؐ کا ابرِ کرم ہر وقت برستا رہتا تھا تاہم کسی کا بے ضرورتِ شدید سوال کرنا آپؐ پر سخت گراں ہوتا تھا، ارشاد فرماتے کہ ''اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھ پیٹھ پر لا دلائے اور بیچ کر اپنی آبرو بچائے تو اس سے بہتر ہے کہ لوگوں سے سوال کرے۔

(ایک دفعہ ایک انصاری آئے اور کچھ سوال کیا، آپؐ نے فرمایا تمہارے پاس کچھ نہیں ہے؟ بولے کہ بس ایک بچھونا ہے جس کا کچھ حصہ اوڑھ لیتا اور کچھ بچا لیتا ہوں اور ایک پانی پینے کا پیالہ ہے آپؐ نے دونوں چیزیں منگوائیں، پھر فرمایا یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟ ایک شخص نے دو درہم لگائے، آپؐ نے فرمایا اس سے بڑھ کر بھی کوئی دام لگاتا ہے؟ ایک صاحب نے ایک کے دو کر دیئے، آپؐ نے دونوں چیزیں دے دیں اور درہم انصاری کو دیئے کہ ایک درہم کا کھانا خرید کر گھر میں دے آؤ اور دوسرے سے رسی خرید و اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو، پندرہ دن کے بعد وہ خدمتِ اقدس میں آئے تو دس درہم ان کے پاس جمع ہو گئے تھے، اس سے کچھ کپڑا خریدا، کچھ غلہ مول لیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ اچھا ہے یا یہ کہ قیامت میں چہرہ پر گدائی کا داغ لگا کر جاتے)۔

ایک دفعہ چند انصاری آئے اور سوال کیا، آپؐ نے عنایت فرمایا، پھر جب تک کچھ رہا، آپؐ نے ان کی درخواست رد نہیں فرمائی، جب کچھ نہیں رہا تو آپؐ نے فرمایا میرے پاس جب تک کچھ رہے گا میں تم سے بچا کر اس کو نہیں رکھوں گا لیکن جو شخص اللہ سے یہ دعا مانگے کہ وہ اس کو سوال و گداگری کی ذلت سے بچائے تو وہ اس کو بچا دیتا ہے اور جو خدا سے غنا کا طالب ہوتا ہے وہ اس کو غنا مرحمت فرماتا ہے اور جو صبر کرتا ہے اللہ اس کو صابر بنا دیتا ہے اور صبر سے کوئی بہتر و وسیع تر دولت کسی کو نہیں دی گئی ہے۔

حکیمؓ بن حزام فتح مکہ میں اسلام لائے تھے، ایک دفعہ انہوں نے آپؐ سے کچھ طلب کیا، آپؐ نے عنایت فرمایا، کچھ دن کے بعد پھر مانگا، آپؐ نے پھر ان کو دیا، تیسری دفعہ پھر سوال کیا، پھر کچھ مرحمت کیا، اس کے بعد فرمایا ''اے حکیم یہ دولت سبز و شیریں ہے، جو استغنا کے ساتھ اس کو قبول کرتا ہے، اس کو برکت ملتی ہے اور جو حرص و طمع کے ساتھ اس کو حاصل کرتا ہے، وہ اس سے محروم رہتا ہے اور اس کی مثال اس شخص کی جیسی ہے جو کھاتا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا، دستِ بالا دستِ زیریں سے بہتر ہے''۔ حکیم پر آنحضرت ﷺ کی نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ جب تک زندہ رہے کبھی کسی سے کوئی معمولی چیز نہیں مانگی۔

حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ صدقات کا مال تقسیم فرما رہے تھے کہ دو صاحب آ کر شامل ہوئے، آپؐ نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو وہ تنومند اور ہاتھ پاؤں سے درست معلوم ہوئے، آپؐ نے فرمایا اگر تم چاہو تو میں اس میں سے دے سکتا ہوں لیکن غنی اور تندرست کام کرنے کے لائق لوگوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

قبیصہ نام ایک صاحب تھے، وہ مقروض ہو گئے تھے، آپؐ کے پاس آئے تو اپنی حاجت عرض کی، آپؐ نے وعدہ کیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا ''اے قبیصہ! سوال کرنا اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا صرف تین شخصوں کو روا ہے، ایک اس شخص کو جو قرض سے زیادہ زیر بار ہو، وہ مانگ سکتا ہے لیکن جب اس کی ضرورت پوری ہو جائے تو اس کو رک جانا چاہئے، دوسرے اس شخص کو جس پر کوئی ایسی ناگہانی مصیبت آ گئی جس نے اس کے تمام مالی سرمایہ کو برباد کیا، اس کو اس وقت تک مانگنا جائز ہے، جب تک اس کی حالت کس قدر درست نہ ہو جائے، تیسرے اس شخص کو جو مبتلائے فاقہ ہو اور محلّہ کے تین معتبر آدمی گواہی دیں کہ ہاں اس کو فاقہ ہے، اس کے علاوہ جو کوئی کچھ مانگ کر حاصل کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔

قسط:(۳۱) ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے مولانا آزاد کی سیاسی فکر پر شبلی کے اثر کو واضح طور پر بیان کرنے سے گریز کیا ہے، حالانکہ شبلی کی سیاسی فکر سے وہ سب سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ الندوہ کی ادارت میں تو وہ مستقل ساتھ رہے، بعد میں بھی وہ مستقل آتے رہے اور الہلال کے زمانہ میں بھی وہ شبلی کے پاس آتے اور ندوہ میں قیام کرتے اور ان سے استفادہ کرتے، شبلی کی سیاسی فکر کو انھیں نے سب سے زیادہ ترقی دی۔

علامہ شبلی کا علی گڑھ جانے سے پہلے ایک مشغلہ اہل حدیث علماء سے مناظرہ بھی تھا، مولانا فاروق چیریا کوٹی کی صحبت میں جو مذاق پیدا ہوا تھا وہ اسی کا اثر تھا، علی گڑھ جانے کے بعد جب مخالفین اسلام کے اسلام اور مسلمانوں پر اعتراضات اور اس کی شبیہ خراب کرنے کا منظر سامنے آیا تو ان کی تمام توجہ اس کی جانب ہوگئی اور پھر انھوں نے کبھی ان مسائل میں دلچسپی نہیں لی، یہاں تک کہ ان کے اپنے شہر اعظم گڑھ کی جامع مسجد میں دیوبندی اور اہل حدیث علماء میں آمین بالجہر اور بالسر کو لے کر معرکہ آرائی ہوئی اور اس سلسلہ میں علامہ شبلی سے فتوی مانگا گیا تو انھوں نے حسب ذیل جواب لکھا:

''آمین جو شخص بالجہر کہتا ہے اس کے پیچھے نماز یقیناً درست ہے، نماز تو فاسق کے پیچھے بھی درست ہے اور آمین بالجہر کہنے والا فاسق بھی نہیں ہے اور جماعت سے ایسے شخص کو الگ نہ کرنا چاہئے اور اس شخص کے آمین بالجہر کہنے سے دوسروں کی نماز میں کچھ اثر نہیں پڑتا اور جماعت سے ایسے شخص کو خارج کرنا گناہ ہے۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ شخص بنظر تفریق جماعت وفساد انگیزی کے یہ فعل کرتا ہے تو اس کا خارج کرنا جماعت سے روا ہے۔ اور حدیث میں آمین آہستہ وزور سے کہنا دونوں طرح پر آیا ہے''۔ واللہ الموفق محمد شبلی نعمانی بندولی (بحوالہ چند رجال اہل حدیث ص ۳۶)

علامہ شبلی کا یہ فتوی چند اور فتاؤں کے ساتھ سعید المطابع بنارس سے ۱۹۰۶ء میں رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔ نوادرات شبلی کی جمع وتدوین میں بے خیالی سے علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر اس میں درج ہونے سے رہ گئی۔

اس کے باوجود ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے اس طرح کے اختلافات کا ذکر کیا ہے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے حوالہ سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ ان پر کوئی اعتماد نہ کر سکا، اس ضمن میں انھوں نے مخالفین شبلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان میں قدیم خیال کے حنفی (دیوبندی، بریلوی) اور اہل حدیث علماء تھے بریلوی علماء مطلقاً اور دیوبند کی ایک جماعت ان کی مخالف ہی رہی۔ سرسید کے تعلیمی وسیاسی تحریک کی مخالفت نے اس دائرہ فکر میں بھی شبلی کا کبھی اعتماد پیدا نہ ہونے دیا۔ اہل حدیث کے لئے شبلی بحیثیت نعمانی کے کبھی قابل قبول نہ ہوئے۔ ان کے لئے جو کشش کسی سلفی یا اثری میں تھی وہ نعمانی میں کبھی نہیں ہو سکتی تھی''۔ (امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ص ۱۵)

یہاں ڈاکٹر صاحب سے تجزیہ کرنے میں ذرا سی چوک

ہوگئی ہے، ان کے دور شباب اور دور آخر کے مسائل ومعاملات میں خلط مبحث ہوگیا ہے۔ آغاز شباب میں ان میں وہی جوش وجذبہ اور اشتعال تھا جو فرق اسلامی کے علمبرداروں میں عموماً پایا جاتا ہے، دور آخر میں ان پر جو اعتراضات تھے، ان کی دو نوعیتیں ہیں، پہلی یہ کہ ان میں جو جدت اور روشن خیالی پیدا ہوئی تھی علمائے دیوبند کا ایک چھوٹا سا حلقہ اس کو پسند نہیں کرتا تھا اور شبلی کے دل میں قدیم علماء اور قدیم اسلامی علوم جس کے وہ خود بہت بڑے عالم تھے اور ان پر مجتہدانہ نظر رکھتے تھے، اس کے بڑے حامی تھے۔ سرسید تحریک کے غالی ہمنوا ان کے اس جذبہ اسلامی کو پسند نہیں کرتے تھے، بظاہر اسے ان کی ناکامی خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ ان کی ناکامی نہیں تھی، انھوں نے قوم کو ایک نئی شاہراہ پر ڈالا جس سے ماضی سے بے پناہ محبت کا جذبہ پیدا ہوا اور ہر نئی روشنی کو تاریکی تصور کر کے منہ پھیرنے سے روکا، آج جب ہم سوا سو برس بعد اس نقطہ نظر کا تجزیہ کرتے ہیں تو شبلی کے نقطہ نظر کی صداقت سامنے آتی ہے اور ان کی کامیابی بھی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ جمود وتعطل کی جو فضا عہد شبلی میں قائم تھی اور جسے توڑنے کے لئے انھوں نے بڑی جدوجہد کی اس کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں، تعجب تو یہ ہے کہ اسے مذہبی محبت کا نام دیا جاتا ہے۔

سوا سو برس سے مسلمانوں کا ہر قدم زوال سے دوچار ہورہا ہے اور ہم اسلام مخالف قوتوں کے درمیان پستے چلے جارہے ہیں، ظاہر ہے ہم میں کہیں نہ کہیں کوئی کمی تو ضرور ہوگی، شبلی کے بعد آج تک کوئی ایسا دانشور نہیں اٹھا جو ہمیں درد کا علاج بتائے، ہر تحریک کے افادی پہلو بھی ہوتے ہیں اور جب قومیں مخالفت کرنا اپنا شیوہ بنا لیتی ہیں اور غور وفکر کرنا ترک کردیتی ہیں تو ان میں پھر شبلی نہیں پیدا ہوتے۔

ڈاکٹر فضل امام رضوی

ڈاکٹر فضل امام (پ: ۱۷/اگست ۱۹۴۰ء) ادیب اور نقاد کی حیثیت سے معروف ہیں، ان کے مضامین کے مجموعے تنقیدی معیار اور افکار ونظریات شائع ہوچکے ہیں۔ کچھ اور کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلی ہیں، ان کا ایک کام موازنہ انیس ودبیر کی ترتیب وتقدیم بھی ہے، جسے ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ نے شائع کیا ہے اور جس کے اب تک متعدد ایڈیشن طبع ہوچکے ہیں، اور اب بھی وہ برابر شائع ہورہا ہے۔

موازنہ کی ترتیب وتدوین میں ڈاکٹر فضل امام نے کیا کاوش کی ہے، ان کے مقدمہ میں صراحت نہیں ہے اور کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق متن میں انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی، ہاں ایک مبسوط مقدمہ ضرور ان کے قلم سے ہے جس میں انھوں نے موازنہ کی اولیت کا اعتراف کیا ہے باوجود اس کے انھوں نے شبلی اور موازنہ پر اتنے اعتراضات کئے ہیں کہ شاید ہی کسی اہل علم نے کئے ہوں گے، وہ شاید دبیر یے ہیں؟ بہرحال ان کے اعتراضات ملاحظہ ہوں:

۱۔ موازنہ انیس ودبیر کی جہتیں ہی فی نفسہ موزوں اور مناسب نہیں، دونوں شاعروں کی نہاد فکر ہی مختلف اور منفرد ہے تو موازنہ اور تقابل کس کام کا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رد الموازنہ، تردید الموازنہ اور المیزان تک نوبت پہونچی''۔ (مقدمہ ص ۶)

۲۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنی اس تصنیف کا نام موازنہ انیس ودبیر رکھ کر غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ (ایضاص ۹)

۳۔ انیس کے کلام کی صفات بیان کرنے میں وہ ایک کامیاب صاحب طرز انشا پرداز ضرور ثابت ہوتے ہیں لیکن تنقید نگاری کے مزاج اور معیار کو سمجھنے سے قاصر ہیں''۔ (ایضا)

۴۔ شبلی نعمانی کی تنقید نگاری کا سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ وہ شخصیتوں سے مرعوب ہوجاتے ہیں''۔ (ایضا)

۵۔ شبلی انیس کے محسنات شعری بیان کرنے میں زبردست تضادات کا شکار ہوئے ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ ان کے قلم سے کیا لکھا جاچکا ہے اور خود اس کی تردید کس طرح کرتے ہیں، موازنہ کے مطالعہ سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ہر جگہ اپنی ذاتی پسند کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کے بعد اسباب پسندیدگی تلاش کرتے ہیں جس کے نتیجے میں خود اپنا بیان ذہن نشین نہیں کر پاتے۔ اور جابجا ٹھوکریں کھاتے ہیں۔(ایضاص۱۰)

۶۔ یوں تو شبلی کی سبھی تحریروں میں تضادات اور تردیدات کا پہلو نمایاں ہے لیکن موازنہ میں اس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔(ایضاص۱۲)

۷۔ جہاں تک سوال کلام انیس اور دبیر کے موازنے کا ہے یہ بھی ایک مستند اور مدلل المیہ ہے کہ شبلی نے دبیر کے مراثی کے وہ ٹکڑے اور حصے نہیں پیش کئے ہیں جو واقعی انیس کے ہم پلہ قرار دیئے جاسکتے ہیں، اس غیر محتاط تقابل میں شبلی سے فاش غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں، جیسے بعض ایسے کلام کو مرزا دبیر کا کلام کہہ کر نقل کیا گیا ہے اور کلام انیس سے موازنہ کیا گیا ہے جو سرے سے مرزا دبیر کا کلام ہی نہیں ہے''۔(ایضاص۱۳)

۸۔ شبلی نعمانی اردو مراثی کی مفصل تاریخ اور مواد کا بھی مطالعہ نہیں رکھتے تھے اور تقابلی مطالعے کے لئے متن کی چھان بین اور صحت کی ضرورت پر بھی توجہ نہیں کرتے تھے''۔(ایضاص۱۴)

۹۔ وہ تاریخ مرثیہ، صنف مرثیہ اور موضوع مرثیہ کے سلسلے میں ناقص اور ادھورا علم رکھتے ہیں۔ حالانکہ علامہ شبلی نے تاریخ اسلام بھی لکھی ہے اور مورخ کی حیثیت سے بھی متعارف ہیں، لیکن موازنہ کی روشنی میں ان کی تاریخ دانی بھی ضعیف نظر آتی ہے''۔(ایضا)

۱۰۔ اور بہت سی مثالیں ان کی تاریخی کتب میں بھی موجود ہیں، جہاں وہ تاریخیت کا خون کردیتے ہیں اور تاویلات وتدلیسات سے کام لیتے ہیں۔ شبلی کا انتشار ذہنی یوں تو ان کی سبھی کتب کا طرہ امتیاز ہے لیکن اس کی واضح اور مضحکہ خیز مثالیں موازنہ میں ملتی ہیں۔(ایضا)

ان شدید تنقیدوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ فضل امام کس درجہ کے نقاد ہیں۔ قاری یہ سمجھے گا کہ انھوں نے موازنہ کا تنقیدی جائزہ لیا ہے، لیکن دراصل ان کے خیالات موازنہ کے جواب میں لکھی جانے والی کتابوں کا خلاصہ ہے، اسے تنقید کے بجائے تبری کہنا چاہئے۔

موازنہ انیس ودبیر اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے، اس سے پہلے نہ مرثیہ پر کوئی کتاب تھی اور نہ انیس ودبیر پر، انیس کی شاعرانہ عظمت نے شبلی کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ موازنہ تقابلی ادب کا بھی اردو میں پہلا نمونہ ہے، نقش اول میں جو کمیاں ہوتی ہیں اور ہونی چاہئے وہ موازنہ میں در آئی ہیں لیکن نفس موضوع ہی کو غلط قرار دینا، کتاب کے نام کو غلط قرار دینا، یہاں تک ان میں انتشار ذہنی کی نشاندہی کرنا یا ان کی تمام تاریخی کتب کو ضعیف قرار دینا اور تاویلات وتدلیسات کا مجموعہ گردانا خود فاضل نقاد کے انتشار ذہنی کا پتہ دیتا ہے، شبلی اردو تنقید کے بانیوں میں ہیں اور فضل امام کو وہ نقاد ہی نظر نہیں آتے۔ اسے کوتاہی اور کم نظری کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا جاسکتا ہے، موازنہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے اس پر جس قدر اعتراض ہوتا ہے اسی قدر زیادہ پڑھی جاتی ہے اور یہ شرف اسی کتاب کو حاصل ہے کہ یہ نہ صرف ذوق شعر وادب میں اضافہ کرتی ہے بلکہ ادبی وتنقیدی شعور کو بھی جلا بخشتی ہے۔ راقم نے اپنی کتاب آثار شبلی میں تنقیدات موازنہ کے جوابات دیئے ہیں جس میں ڈاکٹر فضل امام بھی شامل ہیں۔

مولانا صدرالدین اصلاحی

ایمان بالآخرت

انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو اس نے خود محسوس نہ کیا ہو اس کو اس چیز کے برابر کرلے جسے وہ خود محسوس کرتا ہو۔ محسوس کرنے والے کا بیان خواہ کتنا ہی مؤثر ہو اور سننے والا کتنا ہی گداز قلب کیوں نہ رکھتا ہو، بہرحال دوسرے کی روایت سے آدمی اتنا پائیدار اثر نہیں لے سکتا جتنا ذاتی مشاہدے کی صورت میں لیا کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے قادرالکلام شاعر کی زبان سے بھی سوزِ عشق اور دردِ فراق کے مضامین سن کر آدمی کے دل میں تڑپ پیدا نہیں ہوتی جو خود عشق کی آگ میں جلنے اور ہجر کے انگاروں پر لوٹنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ پس جب تک آدمی کا ایمان محض اس بنیاد پر قائم رہے گا کہ اس کے باپ دادا ان چیزوں کو مانتے تھے، اس میں نہ تو صحیح کیفیات ایمانی پائی جاسکیں گی، اور نہ وہ ایمان کے کامل تقاضے ہی پورے کرسکے گا، اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ایمان محض تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی یقینِ کامل پر مبنی ہو۔

اس یقینِ کامل کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسے کہاں سے حاصل کیا جائے اور کس طرح؟ یہ ایک سوال ہے جو اس موقع پر خود بخود ذہنوں سے اُبھرتا ہے، لیکن جو یاد ہوگا کہ یہی سوال ایمان باللہ کے سلسلہ میں بھی پیدا ہوا تھا، پس جو جواب اس کا اس موقع پر دیا جاچکا ہے، وہی یہاں بھی کفایت کرے گا۔ اپنے اس یقین کو ایک لمحہ کے لیے بھی ذہن سے اوجھل ہونے نہ دیجئے کہ قرآن ہی آپ کا رہنما اور مرجع کل ہے، اس سے رجوع کیجئے وہ بتائے گا کہ جس طرح ایمان باللہ کی استواری اس کے بتائے ہوئے طریق تفکر پر اور اس کے دیئے ہوئے دلائل آفاق وانفس پر اس کے ذکر پر موقوف ہے، اسی طرح ایمان بالآخرت کی مضبوطی اور بیداری بھی ان ہی باتوں پر منحصر ہے۔ اوپر کی بحثوں کو پڑھ لینے کے بعد اب یہ غلط فہمی تو باقی نہ رہی ہوگی کہ قرآن نے توحید اور معاد وغیرہ مبادی دین پر دلائل کا جو انبار لگایا ہے، ان کا تعلق صرف منکرین ہی سے ہے اور وہ صرف ان ہی پر ان حقائق کو ثابت کرنا اور ان پر حجت تمام کرنا چاہتا ہے اور جو لوگ ان اصول ونظریات کو قبول کرچکے ہیں، ان کی ضرورت کے دائرے سے یہ سارے استدلالات باہر ہیں، چنانچہ ایمان باللہ کی بحث میں اس بات کی دلائل کے ساتھ وضاحت کی جاچکی ہے کہ قرآن مومنوں کو بھی ان استدلالات کا حاجت مند ٹھہراتا ہے، ٹھیک یہی حال ایمان بالآخرت کا بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اہل ایمان آثار کائنات پر مسلسل غور وفکر کی نظر ڈالتے رہتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر قیامت کے ہونے والے زلزلے کی خوفناک آوازیں پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ بلند اور قریب سے سننے لگتے ہیں۔ اہل ایمان کے قوائے فکر وعمل کی فطری مشغولیتوں پر اس نے جو تبصرے کیے ہیں، ان میں سے ایک واضح تبصرہ کے الفاظ پھر سنئے اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ، الَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، رَبَّنَا مَاخَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا، سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران) ''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی ساخت میں اور شب وروز کی آمدورفت میں (توحید باری اور یوم

جزاء کے وقوع پر) ان ارباب عقل کے لیے کھلی ہوئی نشانیاں موجود ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے اور رکھتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں (جس کے نتیجہ میں ان کی زبان پکار اٹھے کہ (اے رب! اس (کارخانہ) کو تو نے عبث نہیں بنایا ہے، تو بڑا بلند و برتر ہے، پس ہمیں جہنم کی آگ سے بچائیو!''۔

کیا اس ارشاد باری تعالیٰ کے باوجود یہ خیال کوئی صحیح خیال ہوگا کہ مومن کی ساری متاع ایمان، بالخصوص ایمان بالآخرت کی متاع، صرف سماع پر منحصر ہے، اور کارگاہِ فطرت کے اس کھلے ہوئے صحیفے پر جو دلائل منقوش ہیں، ان سے وہ بالکل ہی بے نیاز ہیں؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ایسا ہو نہیں رہا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایسا ہونا ٹھیک ہے؟ پھر کلام اس بات میں بھی نہیں ہے کہ ایسا کرنے والا ایسا کرنے پر بھی مومن اور مسلم ہیں۔ کلام تو اس امر میں ہے کہ کیا ایسا کرنے پر بھی ہماری تصویر اس تصویر ایمان کا صحیح عکس ہو سکتی ہے جو قرآن نے کھینچی ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ قرآن نے تو اربابِ دانش اور اہل ایمان لوگوں کا ایک امتیازی وصف یہ بھی بتایا ہے کہ وہ برابر خلقتِ کائنات میں تفکر کرتے رہتے ہیں اور اس کے پردوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا، توحید باری اور قیام جزاء کا سراغ پاتے رہتے اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں اور اس ''مشاہدۂ غیب'' میں ان کی نگاہ کی بینائی اور جلوہ یابی برابر بڑھتی رہتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیامت اور محاسبۂ اعمال کا تصور ایک فطری انداز میں آپ سے آپ زندہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا اس تصور کو اس کی خالص فطری غذا ملتی جاتی ہے اور وہ ایک تدریج، ترتیب اور توازن کے ساتھ پروان چڑھتا رہتا ہے اور انسان کے شعور پر چھا جاتا ہے، یہاں تک کہ صرف اس کی کبھی کبھار کی صدائے قال ہی نہیں بلکہ ہر وقت کی صدائے حال بن جاتا ہے اور پھر دیوانے پر ''ہو'' کا وہ اثر نہیں ہوتا جو اس پر قرآن کی آیتوں کا ہوتا ہے، خصوصاً ان آیتوں کا جن میں جزائے اعمال کا ذکر ہو۔ اب اگر ہم اس امتیازی وصف سے اپنے آپ کو بے بہرہ رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے کو کم اندیش اور غافل سمجھنے سے انکار کریں اور اپنی تصویر ایمان کو ناقص ماننے میں بہانے تراشی سے کام لیں۔ یہ تو اپنے ہاتھوں اپنا نقصان ہوگا، جس سے ہر صاحبِ دانش یعنی مسلمان کو بچنا چاہئے۔ پھر یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن نے ان الفاظ میں صرف ایک صورت واقعہ کی خبر دی ہے، بلکہ دراصل یہ انشاء کا قالب ہے جو خبر کے جامہ میں ملبوس کر کے پیش کیا گیا ہے، یعنی کہنا یہ نہیں کہ مؤمن ایسا کرتا ہے بلکہ فی الحقیقت کہنا یہ ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہئے۔

اسی طرح سورۂ مرسلات کی ابتدائی آیات کو پڑھئے جہاں ہواؤں کے مختلف حالات اور ان کے گوناگوں اثرات کو یوم جزاء کی آمد پر بطور قسم (شہادت اور دلیل) پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا، عُذْرًا اَوْ نُذْرًا، اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ۔ ''پھر جو (اپنی تعریف کے ذریعہ) لوگوں کو یاد دہانی کرتی رہتی ہیں تاکہ (غافلوں کے خلاف اللہ کی طرف سے) معذرت (اور حجت) ہو اور (رب سے ڈرنے والوں کے لیے) ڈراوے کا کام دے، (ہواؤں کے یہ مختلف حالات اور اثرات شاہد ہیں کہ (جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ وقوع میں آ کر ہی رہے گی''۔ سورہ ہود ۱۰۳ کے اندر نافرمانی رب کی پاداش میں ہلاک ہونے والی چند بستیوں اور قوموں کی سرگزشت سنانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ، یقیناً اس (داستان ہلاکت) کے اندر اس شخص کے لیے (جزائے اعمال کی) ایک بڑی زبردست نشانی ہے جو سزائے آخرت کا خوف رکھتا ہو''

مفتی امانت علی قاسمی استاذ ومفتی دارالعلوم وقف دیوبند

حیوانات کے حقوق اور احکام

شوق کے لئے خطرناک جانوروں کو باندھ کر رکھنا:

آج کل بعض لوگ اپنے شوق کے لئے خطرناک جانوروں کو قید کر کے رکھتے ہیں اور اس سے دل لگی کرتے ہیں، اوپر کی تفصیلات کو سامنے رکھا جائے تو اس کی اجازت نہیں معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ بلاوجہ اور بلا کسی جائز اور مناسب مصلحت کے جانوروں کو قید کرنا اس کو عذاب دینا ہے جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے نهى عن تعذيب الحيوان (ملاعلی قاری، مرقاۃ المفاتیح، دارالفکر بیروت ۲۰۰۲ء، ۶/۲۱۹۹) ابن ہمام نے لکھا ہے: فإن تعذيب الحيوان بلا فائدة مما يجب الاحتراز عنه (ابن الہمام ،کمال الدین، فتح القدیر دارالفکر، ۹/۴۹۵) اس کے ساتھ اس طرح کے جانور کو قید میں رکھنے میں ایک دوسرا مفسدہ بھی ہے کہ اگر کبھی وہ جانور اپنے قید سے نکل گیا تو بہت سے انسانی جانوں کا نقصان ہوسکتا ہے، گویا یہ عمل اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے پھر اس میں پڑوسیوں کو بھی تکلیف پہونچانا ہے، اس لئے کہ اس کے پڑوسی اپنے آپ میں خوف ودہشت محسوس کریں گے، پتہ نہیں کب یہ خطرناک جانور ہم لوگوں کو نقصان پہونچادے، اس لئے اس قسم کے جانور کو قید میں رکھنے کی اجازت نہیں ہوسکتی ہے۔

جانوروں پر میڈیکل تجربات:

جانوروں پر میڈیکل تجربات کا عام چلن ہے اور اس کی مختلف صورتیں اس وقت رائج ہیں بعض جانوروں پر آپریشن کا تجربہ کیا جاتا ہے جب کہ بعض جانوروں پر دواؤں کا تجربہ کیا جاتا ہے، پہلے جانور کو بے ہوش کیا جاتا ہے یا اس میں ایسے جراثیم داخل کئے جاتے ہیں جو بیماری پیدا کریں پھر اس دوا کا اس پر تجربہ کیا جاتا ہے یہ عمل درست ہے یا نہیں؟ پہلے یہاں چند اصولی اور تمہیدی باتیں ذکر کی جاتی ہیں جس کی روشنی میں اس مسئلہ کو سمجھنا اور حل کرنا آسان ہوگا۔

پہلی بنیادی بات یہ ہے اسلام نے جانوروں کو بلا وجہ قتل کرنے اس کو تکلیف دینے سے منع کیا ہے، اگر صحیح غرض ہو جو شریعت کے یہاں معتبر ہے تو پھر جانور کو قتل کرنا بھی جائز ہے اور اس کو تکلیف دینا بھی درست ہے۔ وفي هذا دلالة واضحة على ان تعذيب الحيوان بلا سبب معصية تستوجب العقاب (شاذلی، حمد بن عبدالعزیز، الادب النبوی دارالمعرفہ، بیروت، ص:۴۳)

دوسری بات: یہ ہے کہ شریعت بندوں کے منافع اور رفع مفاسد کے اصول پر قائم ہے جس چیز کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے اس میں ہماری مصلحت وابستہ ہے اور جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع کیا ہے اس میں ہمارے مفاسد وابستہ ہیں مصالح کے سلسلے میں علامہ شاطبی نے بڑی عمدہ بحث کی ہے جو بھی مصالح دنیویہ ہیں وہ ایسے نہیں ہیں کہ اس میں صرف بندوں کے مصالح ہی وابستہ ہوں، بلکہ اس کے ساتھ مفاسد اور تکالیف بھی وابستہ ہیں، اسی طرح کوئی ایسا مفسدہ نہیں ہے جس میں صرف فساد ہو، بلکہ اس سے اس کچھ مصالح اور خیر بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے شریعت غالب اور اکثریت کا اعتبار کرتی ہے جس میں نفع زیادہ ہے وہ مصالح کے حکم میں ہے اور جس میں نقصان زیادہ ہے وہ مفاسد کے حکم میں ہے، قرآن کریم کی آیت وإثمهما أكبر من نفعهما

(البقرۃ:۲۱۹) سے اس اصول پر روشنی پڑتی ہے (الشاطبی، ابراہیم بن موسی، الموافقات، دار ابن عفان ۱۹۹۷ء، ۴۴/۲) عز بن عبد السلام نے اسی ضمن میں لکھا ہے کہ اگر مصالح اور مفاسد کا اجتماع ہوجائے اور مفاسد سے بچتے ہوئے مصالح کا حصول ممکن ہو تب تو مصالح کو حاصل کرلیا جائے گا، لیکن اگر مفاسد سے بچنا ممکن نہ ہو تو دیکھا جائے گا کہ مفسدہ، مصلحت سے بڑا ہے یا چھوٹا؟ اگر مفسدہ مصالح سے اعظم ہے تو ایسی صورت میں مفسدہ کی رعایت کرتے ہوئے اس کو ترک کردیا جائے، درأ المفاسد اولی من اجلب المنافع لیکن اگر مصلحت، مفسدہ سے بڑا ہے تو ایسی صورت میں مفسدہ کے ساتھ ساتھ مصلحت کو حاصل کرلیا جائے گا (عز بن عبد السلام، قواعد الاحکام فی مصالح الانام، مکتبۃ الطیبات الازہریہ ۱۹۹۱ء، ۹۸/۱)

تیسری قابل توجہ امر یہ ہے کہ اللہ تعالی نے پوری کائنات کو انسانوں کے لئے مسخر کردیا ہے أَلَمْ تَرَوْا أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً. (لقمان:۲۰) گویا اللہ تعالی نے پوری کائنات کو انسانوں کا خادم بنادیا ہے جس میں حیوانات بھی داخل ہیں، پس جانور انسان کے منافع اور اس کے راحت رسانی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، یہی وجہ ہے انسان کے کھانے کے لئے جانوروں کو قتل کرنا، سواری اور بردباری کے لئے اس کو تکلیف دینا درست ہے۔

اس تمہیدی باتوں کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا آسان ہے کہ انسانی خدمت کے لئے جانوروں پر میڈیکل ریسرچ جائز ہے، علامہ شاطبی نے ذکر کیا ہے مقاصد شریعت پانچ ہیں: حفظ نفس، حفظ عقل، حفظ نسل، حفظ دین، حفظ مال جس کو ضروریات خمسہ کہا جاتا ہے اور جن کی رعایت تمام ملتوں میں کی جاتی ہے (الموافقات ۲۰/۲) جانوروں پر میڈیکل ریسرچ کرنے میں حفظ نفس، عقل اور نسل تینوں کی رعایت ہے، اس لئے کہ اگر پہلے دواؤں کو تجربہ نہیں کیا اور انسان کو کھلا دیا گیا تو اس میں انسان کے جان اور عقل دونوں ضائع ہونے کا خطرہ ہے اور میڈیکل تجربات نہ ہونے کی وجہ پہلے سے بیماری کا علاج معلوم نہیں کیا جاسکے گا اور بڑی بڑی وبائی بیماری پیدا ہوگی تو اس وقت اس کے علاج کی سبیل نہیں ہوگی جس سے نسل کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اس لئے جانوروں پر میڈیکل تجربات کی اجازت ہونی چاہئے۔

قواعد فقہیہ میں اگر غور کیا جائے تو بھی اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے مثلا قاعدہ ہے الضروریات تبیح المحظورات اور حفظ نسل، نفس اور عقل ضرویات میں سے اور جانوروں کو تکلیف دینا محظورات میں ہے، لہذا ضرورت کی وجہ سے یہ محظور جائز ہوجائے گا، اس کے علاوہ درج ذیل قواعد سے بھی اس کا جواز معلوم ہوتا ہے یتحمل الضرر الخاص لدفع الضرر العام، إذا تعارضت مفسدتان روعی اعظمها ضررا بارتكاب بأخفهما.

بہر حال جانوروں پر میڈیکل ریسرچ یہ جائز ہے البتہ ضروری ہے چند چیزوں کی رعایت کی جائے: (۱) جانوروں کو بلا وجہ تکلیف نہ دی جائے (۲) جانوروں پر میڈیکل ریسرچ واقعی ضرورت ہو (۳) یہ میڈیکل ریسرچ انسان کے حق میں مفید ہو مضر نہ ہو (۴) ضرورت کے سلسلے میں قاعدہ ہے کہ بقدر ضرورت استعمال کی جائے اس کو بھی یہاں ملحوظ رکھا جائے (۵) جہاں تک ہوسکے ان جانوروں پر ریسرچ کیا جائے، جن کو قتل کرنا جائز ہے یا ان جانوروں پر جو انسانی منافع کے لئے استعمال نہیں ہوتے ہیں، لیکن اگر کوئی چارہ نہ ہو تو پھر ماکول اللحم اور جو جانور انسان کے لئے قابل انتفاع ان سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

دواؤں کے لئے زندہ جانور کو بے ہوش کرنا:

بعض مرتبہ زندہ جانور کو بے ہوش کرکے اس کا کوئی

عضو نکال لیا جاتا ہے یا جانور میں کوئی آلہ رکھ دیا جاتا ہے جس سے جانور کو بسا اوقات تکلیف بھی ہوتی ہے؛ ماقبل کی تفصیل کو سامنے رکھا جائے تو اس کے عدم جواز کی کوئی وجہ نہیں ہے، فقہاء نے جانور کے اعضاء سے علاج کرنے کی اجازت دی ہے، فتاویٰ ہندیہ میں ہے: لا بأس بالتداوی بالعظم إذا کان عظم شاۃ أو بعیر. (فتاویٰ ہندیہ ۵/۳۵۴)

البتہ ضروری ہے حلال اور پاک جانوروں کے کسی عضو سے علاج کیا جائے حرام اور ناپاک جانوروں سے نہیں، الا یہ کہ حرام جانور سے علاج کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ باقی نہ رہ جائے تو پھر اس کی بھی گنجائش ہے، اس لئے کہ انسانی جان کی حفاظت ضروریات میں سے ہے جس کا تحفظ ضروری ہے اور اس کے لئے جانور کی جان بھی لی جاسکتی ہے تو اس کے جسم کو باقی رکھ کر اس کے کسی عضو سے فائدہ اٹھانا بدرجہ اولیٰ جائز ہوگا۔

شکار کی قانونی پابندی:

بعض جانوروں کی نسلیں ختم ہورہی ہیں، جانور انسانی نفع کے ساتھ ساتھ ماحولیات کو انسان کے موافق بنانے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں ان جانوروں کا ختم ہوجانا ماحولیات کے لئے بہت نقصان دہ ہے، اس لئے حکومت اس طرح کے جانور کے شکار پر پابندی عائد کردیتی ہے، اسی طرح بعض جانوروں کو حکومت قومی جانور قرار دے دیتی ہے جس کو شکار کرنا اور ذبح کرنا منع ہے اور یہ ممانعت شرعی طور پر واجب العمل ہے، اس لئے کہ حکومتی قوانین اگر شریعت کے خلاف ہوں تو اس کی پیروی درست نہیں ہے، لیکن حکومت کے وہ قوانین جو مباح امور سے تعلق رکھتے ہوں اس پر عمل کرنا واجب ہے، خاص کر جب کہ اس ممانعت کا تعلق حقوق انسانی سے ہو اور اس سے تمام انسانوں کا نفع متعلق ہو تو اس قانون کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، حکومت جن جانوروں کو شکار کرنے سے منع کرتی ہے ان کا شکار کرنا کوئی واجب اور ضروری چیز نہیں ہے، بلکہ مباح ہے اور مباح کاموں میں حکومتی قوانین کی رعایت ضروری ہے، علامہ شامی لکھتے ہیں: طاعة الإمام فی غیر المعصیة واجبة فلو أمر بصوم وجب (ردالمحتار ۸/۱۱۸) مفتی تقی عثمانی صاحب نے لکھا ہے: ''فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ اگر اولی الامر یہ حکم جاری کردے کہ لوگوں کے لئے خربوزہ کھانا منع ہے تو اب رعایا کے لئے خربوزہ کھانا حرام ہوجائے گا بشرطیکہ وہ یہ احکام عام مصلحت کے تحت جاری کریں'' (تقی عثمانی، جدید معاشی مسائل، اسلامیات پبلشر ۲۰۰۸ء، ۱/۱۸۷) مفتی محمود الحسن صاحب لکھتے ہیں: ''رعایا کے ہر فرد کو اپنی حکومت کے ہر جائز قانون کی پابندی لازم ہے خلاف ورزی کرنا جرم ہے جس سے عزت اور جان کو خطرہ ہے جس کی حفاظت ضروری ہے'' (مفتی محمود الحسن، گنگوہی، فتاویٰ محمودیہ، مکتبہ شیخ الاسلام دیوبند ۲۰۰۸ء، ۴/۵۷۰)

''مہمان پرندہ'' کا شکار کرنا:

حکومت جنگلات میں شکار سے منع کرتی ہے اور بعض نہروں اور جھیلوں پر جو موسم کے لحاظ سے پرندے آتے ہیں جن کو ''مہمان پرندہ'' کہا جاتا ہے اس کو شکار کرنے سے منع کرتی ہے اس پر بھی عمل کرنا شرعاً واجب ہے، اس لئے کہ حکومت کے قانون کی رعایت مباح کاموں میں واجب ہے اور رعایت نہ کرنے کی صورت میں انسان کی جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور جان کو خطرہ میں ڈالنا جائز نہیں ہے لا تلقوا بأیدیکم إلی التهلکة (البقرہ: ۱۹۵) اور بعض مرتبہ وطنی قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے انسان کو ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب کہ اپنے آپ کو ذلیل کرنا درست نہیں ہے، حدیث میں ہے: لا ینبغی للمؤمن أن یذل نفسه. (ترمذی شریف، حدیث نمبر: ۲۲۵۴)

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ فقہاء نے مباحات اور مجتہد فیہ امور میں حکام وقت کی اطاعت کو واجب قرار دیا ہے اور ان کے خلاف کرنا سخت گناہ ہے (بدائع الصنائع، دار الکتب العلمیہ بیروت ۷/۱۰۰)

ان تصریحات کی روشنی میں حکومتی قوانین کو تسلیم کرنا ضروری ہے۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لئے جانور ذبح کرنا:

اگر مسلمان ملے جلے معاشرہ میں رہتے ہوں اور تکثیری سماج کا ایک حصہ ہوں وہاں اگر کوئی گروہ خاص جانور کو معبود اور مقدس مانتا ہو اگر اس کو ذبح کیا جائے تو اس سے ان کی دل آزادی ہوتی ہے، فرقہ وارانہ ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے یا حکومت نے اس کو ذبح کرنے کی پابندی عائد کردی ہے تو اس سلسلے میں مسلمانوں کو اس جانور کا ذبح ترک کردینا چاہئے، اسلام نے کسی کو تکلیف پہنچانے سے منع کیا ہے المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده. (مسند احمد، مسند عبداللہ بن عمرو، حدیث نمبر:٦٥١٥) جب کہ مسند احمد کی ہی بعض روایت میں من سلم الناس بھی ہے۔(حدیث نمبر:٧٠٨٦)

تکثیری سماج میں اس جانور کو ذبح کرنا آپسی انتشار اور فتنہ کا باعث ہوگا، فرقہ وارانہ فسادات بھڑکنے کے امکانات ہیں جس میں جانوں کا بھی نقصان ہے ظاہر ہے ایسی صورت میں اس عمل کی کیسے اجازت دی جاسکتی ہے، صاحب تفسیر مظہری نے معبودان باطلہ کو برا بھلا نہ کہنے کے ضمن میں ایک اصول لکھا ہے کہ اگر کوئی نیک کام معصیت کی طرف لے جانے والا ہو تو اس نیک کام کا ترک کرنا بھی واجب ہے وفيه دليل ان الطاعة اذا ادت إلى معصية راجحة وجب تركها لان ما يؤدى إلى الشر شر. (مظہری، ثناءاللہ، التفسیر المظہری، مکتبہ الرشیدیہ پاکستان، ٢٧٦/٣)

دوسری چیز یہ ہے کہ جب حکومت نے اس پر پابندی عائد کردی ہے تو حکومتی قانون کی رعایت بھی ضروری ہے، کیوں کہ اس کی خلاف ورزی اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے جیسا کہ ماقبل میں اس کی تصریح گزر چکی ہے، البتہ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے اگر وہ حلال جانور ہے تو مسلمانوں کو اس کے حلال ہونے کا اعتقاد رکھنا واجب ہے اور اگر کوئی خلاف قانون اس جانور کو ذبح کردے اور قانون کی گرفت میں نہ آئے تو اس جانور کا کھانا اور اس کا گوشت خریدنا جائز ہے، اس لئے کہ فی نفسہ وہ حلال جانور ہے۔

استاد الاساتذہ حضرت **رحمن جامیؔ**۔ حیدرآباد

غزل

ہاتھ انقلابِ وقت کے سفّاک کب نہ تھے
پھر بھی ہم اپنی چاہ میں بے باک کب نہ تھے

اہلِ جنوں کے سامنے ان کی نہ چل سکی
ورنہ یہ اہلِ ہوش بھی چالاک کب نہ تھے

حائل تھی تیری ذات سمندر کے روپ میں
ہم بھی تو اپنی ذات سے پیراک کب نہ تھے

سب ہوش کھو چکے جو ہُوا سامنا ترا
ورنہ یہ لوگ صاحبِ ادراک کب نہ تھے

خود اپنی زندگی کی زلیخائی کے سبب!
دامن ہم اہلِ دل کے یہاں چاک کب نہ تھے

رہ رہ کے جل اٹھا مرے احساس کا لاؤ
یوں بھی شرارِ درد پسِ خاک کب نہ تھے

محفوظ تیرے سائے میں رہ کر زمیں پہ بھی
ہم اہلِ درد کشتۂ افلاک کب نہ تھے

جامیؔ ہم ان کے بارے میں یوں بدگماں سہی
لیکن ارادے اُن کے بھی ناپاک کب نہ تھے

ڈاکٹر مفتیہ رقیہ شکیل خان۔حیدرآباد

حضورِ اکرمؐ کے اخلاق پوری انسانیت کے لیے نمونہ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اخلاقِ حسنہ کے پیکر ہیں زندگیاں بیت گئیں اور قلم ٹوٹ گئے لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف کا ایک باب بھی پورا نہ ہوا۔ کائناتِ ارض و سماں میں سب سے اعلیٰ و ارفع ہستی محبوب رب کونین سید المرسلین، خاتم النبیین اور رحمۃ للعالمین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس کے اوصاف حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ کے بارے میں کچھ لکھتے وقت نہ صرف تنگ داماں کا احساس ہوتا ہے کہ ایسا قلم کہاں سے لائیں جو تاجدار کائنات کے اوصاف قلمبند کر سکے ایسے الفاظ کہاں سے ڈھونڈیں جن سے مدحتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ادا ہو سکے۔

خوشبو ہے دو عالم میں تیری اے گُل چیدہ
کس منہ سے بیاں ہوں تیرے اوصافِ حمیدہ

آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جن کی شان میں اللہ رب العزت نے سارا قرآن نازل فرمادیا۔ قرآن شانِ محمدی حضور علیہ السلام کے سراپا پُرنور سے لے کر اخلاق و کردار تک آپ کی گفتار سے لے کر اٹھنے، بیٹھنے، کھانے، پینے، چلنے پھرنے کی ایک ایک ادا تک کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ سیرت مطہر کو اہل ایمان کے لیے کامل اسوہ حسنہ، خوبصورت ماڈل قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.

(الاحزاب) ''بے شک تمہیں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پیروی بہتر ہے''

گویا زندگی گزارنے کا جامع ضابطہ حیات اگر کوئی ہے تو وہ محمد رسول اللہ کی حیات مبارکہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں نہ کوئی آپ جیسا کامل انسان بنایا ہے نہ بنائے گا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت و رسالت کی تکمیل ہی نہیں ہوئی بلکہ تمام کمالات انسانی، اوصاف اور اخلاق کی تکمیل بھی بدرجہ اتم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات پر ہو چکی ہے اور آپ کے اخلاق کی اس بلندی کی خود اللہ تعالیٰ نے گواہی دے دی اور فرمایا:

وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ. (القلم) ''اور بے شک آپ عظیم الشان خلق پر قائم ہیں (یعنی آدابِ قرآنی سے مزین ہیں)''

تو جس ہستی کے اخلاق باکمال کے عظمتوں اور رفعتوں کی گواہی خود رب کائنات نے دے دی ہے جس کا خلق ہی قرآن قرار پایا اس کے اخلاقی اوصاف کے بارے میں کچھ مزید کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے یہی وجہ ہے کہ جب صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں سوال کیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے الٹا ان پر سوال کر دیا کیا تم نے کبھی قرآن نہیں پڑھا جو مجھ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھتے ہو کیونکہ قرآن نے جو عمدہ اخلاق بتائے ہیں وہ سب کے سب اخلاق تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلق عظیم میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں۔

یوں تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمدہ اخلاق، بہتر عادات اور اچھے خصائل کا احاطہ مشکل ہی نہیں ناممکن ہے کیوں کہ آپ کی زندگی کا لمحہ بہ لمحہ آپ کے بہتر اخلاق کا آئینہ اور عکاس ہے لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق

سے متعلق کچھ انمول موتیوں کو اس مضمون میں پرو کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس امید سے کہ ہم ان اخلاق حسنہ، خصائل حمیدہ اور عادات ممتازہ کو اختیار کر کے اس دنیا میں بھی خوشحال زندگی گزاریں اور روز قیامت بھی سرخرو اور کامیاب ہوسکیں۔

اھل خانہ کے ساتھ رسولؐ کا حسن سلوک :

حضرت اسود بن علقمہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے میں نے دریافت کیا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ تعامل کیسا ہوا کرتا تھا؟ اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا: آپ گھر میں اپنے اہلِ خانہ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے اور جب نماز کا وقت ہوتا تھا تو اٹھ کر نماز کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ (صحیح بخاری)

حضرت عروۃ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تنہا ہوتے تھے تو کیا کرتے تھے؟ آپ نے فرمایا اپنے کپڑے سل لیا کرتے تھے، اپنے جوتے ٹانک لیتے تھے اور ایک عام انسان اپنے گھر والوں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے، آپ بھی وہ سبھی کام اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ (مسند احمد، شیخ البانی اسے صحیح قرار دیا ہے)

نوکروں کے ساتھ رسولِ اکرمؐ کا برتاؤ:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دس سالوں تک خدمت کی۔ اللہ کی قسم! اس دوران رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے نہ تو کبھی اُف کہا اور نہ ہی کبھی مجھ سے یہ پوچھا کہ یہ کام کیوں کیا؟ اور یہ کام تم نے کیوں نہیں کیا؟ (متفق علیہ)

صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مدت میں کبھی کوئی عیب نہیں لگایا۔

بچوں کے ساتھ حضورؐ کا حسنِ سلوک :

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصار کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کے بچوں سے سلام کرتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ (سنن نسائی، اسے شیخ البانی نے صحیح قرار دیا ہے)

عام لوگوں کے ساتھ محمدؐ کا حسنِ تعامل:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے دس سالوں تک رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت انجام دی اور ہر طرح کی خوشبوئیں سونگھی، لیکن رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم سے بہتر کسی چیز کی خوشبو نہیں پائی۔ آپ کی ملاقات جب کسی صحابی سے ہوتی تو آپ اس کے ہمراہ کھڑا ہو جایا کرتے تھے اور اس وقت تک واپس نہیں ہوتے تھے جب تک کہ وہ انسان واپس نہ ہو جاتا۔ جب آپ کسی صحابی سے ملتے اور وہ آپ کا ہاتھ تھام لیتا تھا تو آپ بھی اس کا ہاتھ تھام لیا کرتے تھے اور آپ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نہیں نکالا کرتے تھے حتی کہ وہ شخص نکال لیا کرتا تھا۔ جب آپ کسی صحابی سے ملتے اور وہ آپ کی کان طلب کرتا تو آپ اپنا کان اس سے قریب کر دیا کرتے تھے حتی کہ وہ خود وہاں سے ہٹ جاتا تھا۔ (بخاری)

رسولِ اکرمؐ کی کمال فیاضی:

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب بھی کسی چیز طلب کی گئی ہو، آپ نے اس کے جواب میں ''نا'' نہیں فرمایا۔ (متفق علیہ)

رسولِ اکرمؐ کی کشادہ دلی:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب کبھی دو معاملوں کے درمیان اختیار دیا گیا تو آپ نے ان میں سے آسان ترین

معاملہ کو اختیار کیا بشرطیکہ وہ گناہ پر مبنی نہ ہو۔ اگر وہ گناہ پر مبنی ہوتا تو پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے سب سے زیادہ دور رہتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہاں، جب اللہ کی حرمت پامال کی جاتی تھی تو اللہ کے لیے آپ انتقام لیا کرتے تھے۔ (متفق علیہ)

رسول اللہؐ جب پسندیدہ و ناپسندیدہ چیزیں دیکھتے تو کیا کرتے؟

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کوئی پسندیدہ چیز دیکھتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے: ''**الحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات**''، یعنی ہر طرح کی تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس کی خاص نعمت سے اچھائیاں انجام کو پہنچتی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ناپسندیدہ چیز دیکھتے تو پھر یہ دعا پڑھتے تھے: ''**الحمد لله علی کل حال**'' یعنی ہر حال میں تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ (سنن بیہقی، شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے)

حضورِ اکرمؐ کا تواضع:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سواری پر اپنے پیچھے کسی انسان کو بٹھاتے تھے، کھانا زمین پر رکھ کر کھاتے تھے، غلاموں کی دعوت قبول فرماتے تھے اور گدھے کی سواری کیا کرتے تھے۔ (اسے امام حاکم نے روایت کیا ہے اور شیخ البانی نے صحیح قرار دیا ہے)

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی کبھی گدھے کی سواری کیا کرتے تھے، اپنا جوتا از خود ٹانک لیا کرتے تھے، قمیص کی رفو کر لیا کرتے تھے، اونی کپڑا پہنتے تھے اور کہا کرتے تھے: ''کوئی میری سنت سے اعراض کرے گا تو وہ میری راہ پر نہیں ہوگا''

(مسند ابن عساکر اور شیخ البانی نے اسے حسن قرار دیا ہے)

حضورِ اکرمؐ کا عفو و درگزر:

کفارِ مکہ نے وہ کونسا ایسا ظالمانہ برتاؤ تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ کیا ہو مگر فتح مکہ کے دن جب یہ سب جبارانِ قریش انصار و مہاجرین کے لشکروں کے محاصرہ میں محصور و مجبور ہو کر حرمِ کعبہ میں خوف و دہشت سے کانپ رہے تھے اور انتقام کے ڈر سے ان کے جسم کا ایک ایک بال لرز رہا تھا۔ رسولِ رحمت نے ان مجرموں اور پاپیوں کو یہ فرما کر چھوڑ دیا اور معاف فرما دیا کہ: ''آج تم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے، جاؤ تم سب آزاد ہو''

ایک کافر کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پکڑ کر لائے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نے آپ کے قتل کا ارادہ کیا تھا وہ شخص خوف و دہشت سے لرزہ براندام ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم کوئی خوف نہ رکھو بالکل مت ڈرو اگر تم نے میرے قتل کا ارادہ کر لیا تھا تو کیا ہوا؟ تم کبھی میرے اوپر غالب نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ خداوندِ تعالیٰ نے میری حفاظت کا وعدہ فرما لیا ہے۔ (شفاء قاضی عیاض، ج:اول، ص:۶۳ وغیرہ)

الغرض اس طرح کے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ہزاروں واقعات ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ حلم وعفو یعنی ایذاؤں کا برداشت کرنا اور مجرموں کو قدرت کے باوجود بغیر انتقام کے چھوڑ دینا اور معاف کر دینا آپ کی یہ عادتِ کریمہ بھی آپ کے اخلاقِ حسنہ کا وہ عظیم شاہکار ہے جو ساری دنیا میں عدیم المثال ہے۔ حضرت بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: اپنی ذات کے لیے کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے انتقام نہیں لیا، ہاں البتہ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کا اگر کوئی مرتکب ہوتا تو ضرور اس سے مواخذہ فرماتے۔ (بخاری، ج:اول)

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ پر ہم تمام کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمد زاهد ناصری القاسمی۔حیدرآباد

سیکولر اور فرقہ پرستوں کا اختلاف اور مسلم قیادت: اہمیت وضرورت

اللہ پاک نے قرآن پاک میں قومی اعتبار سے انسانوں کے دو حصوں میں منقسم ہونے کا ذکر فرمایا ہے: کافر اور مومن (التغابن: 2) انھیں مسلم اور غیر مسلم کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اپنے ملک عزیز ہندوستان میں مسلم قوم کی تعداد چودہ (14) فیصد اور غیر مسلم قوم کی مجموعی تعداد چھیاسی (86) فیصد ہے، اس ملک میں دونوں قوموں کی چھوٹی بڑی مختلف سیاسی پارٹیاں موجود ہیں، جن میں انڈین نیشنل کانگریس (آئی این سی) اور بھارتی جنتا پارٹی (بی جے پی) مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، سوئے قسمت کہ دونوں ہی پارٹیاں غیر مسلموں کی ہیں، بی جے پی نے تاحال مجموعی طور پر کم وبیش بارہ سال مرکز میں حکومت کی ہے، اس نے ہمیشہ صرف اور صرف غیر مسلموں کے ووٹ کی بنیاد پر حکومت سازی کی ہے؛ کیونکہ مذہبی شدت پسندی کی وجہ سے مسلمانوں کا ووٹ اسے نہ کے برابر حاصل ہوا اور اس نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، جبکہ کانگریس ہمیشہ مسلم ووٹوں کی محتاج رہی؛ لہٰذا وہ ہمیں اپنا ووٹ بینک سمجھتے ہوئے لبھاتی رہی اور راج کرتی رہی، اسے جہاں بھی اقتدار حاصل ہوا اس میں غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ مسلم ووٹوں کی شراکت داری بھی نمایاں رہی ہے۔

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کانگریس اور بی جے پی دونوں ہی غیر مسلموں کی پارٹیاں ہیں اور ''الکفر ملة واحدة'' کی رو سے وہ سب ایک ہیں تو پھر کانگریس پارٹی مسلم ووٹوں کی محتاج کیوں ہے، وہ بھی بی جے پی کی طرح مسلم ووٹوں کے بغیر حکومت سازی کیوں نہیں کر پاتی؟؟ اس کا جواب تو واضح ہے کہ برادران وطن میں ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کٹر ہندو قوم پرستی، یعنی ہندوتوا کے علمبردار ہیں اور وہ ایک مخصوص طبقے کی بالادستی قائم کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتے ہیں، ان کی مختلف شاخوں پر مشتمل ایک تنظیم ہے جو آر ایس ایس (راشٹریہ سویم سیوک سنگھ) سے مشہور ہے، جس کی ایک سیاسی شاخ بی جے پی بھی ہے۔ دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے، جو غیر مسلم تو ہیں، مگر انسانیت کی رمق ان میں ابھی بھی باقی ہے، وہ لوگ آر ایس ایس کے نظریات کو قبول نہیں کرتے اور سیکولر کہلاتے ہیں، اس فہرست میں کانگریس کے علاوہ مختلف صوبائی پارٹیاں بھی شامل ہیں۔

فرقہ پرستوں کا ووٹ تو ہر حال میں بی جے پی یا اس کی حلیف پارٹی کو ہی ملتا ہے، رہی بات غیر مسلم سیکولر ووٹ کی تو وہ مختلف سیکولر پارٹیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں مسلم ووٹوں کی حیثیت فیصلہ کن ہوتی ہے؛ چونکہ ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ کانگریس کی بھی جدوجہد شامل تھی اور مرکزی طور پر بی جے پی سے ڈٹ کر مقابلے کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور بڑی سیکولر پارٹی نہیں ہے، اس وجہ سے مسلمان اپنے دینی، ملی اور سیاسی قائدین کی طرف سے اس کی تائید وحمایت کی بنیاد پر ہمیشہ اسے یا اس کی حلیف پارٹی کو ہی ووٹ دیتے رہے اور اسے حکومت حاصل ہوتی رہی، مگر چند سالوں میں ہندوتوا کی زہریلی ہوا سے بہت سے سیکولر برادران وطن بھی متأثر ہو گئے، نتیجتاً سیکولر پارٹیوں کے حق میں مسلمانوں کے اتحاد کے باوجود بی جے پی اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی، اس نے مختصر سی مدت میں جس طرح فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسلمانوں سے متعلق ملکی اور اسلامی قوانین میں ردوبدل کیا، نیز

عبادت خانے کو بت خانے میں تبدیل کرنے کا قانونی جواز فراہم کیا اور اس ملک سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کرنے کے لیے ''سی اے اے'' کی شکل میں ایک سیاہ اور ظالمانہ قانون بنایا ہے، اس کی مثال کانگریس کے طویل دور حکومت میں بھی نہیں ملتی؛ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کانگریس نے بھی اپنی قوم کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کا استحصال کیا ہے اور کئی موقعوں پر اس سے بھی مسلمانوں کو نقصانات پہنچے ہیں، اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ۶/ دسمبر ۱۹۹۲ء میں فرقہ پرستوں نے یوپی کی بی جے پی حکومت کی نگرانی میں بابری مسجد کو شہید کردیا اور اس وقت کے کانگریسی وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ پر اسرار طور پر خاموشی اختیار کیے رہے؛ لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ کانگریس وغیرہ نے مسلمانوں کو یہاں کا ناگرک اور شہری سمجھا اور مجموعی طور پر یہاں سے ہمارے وجود کو ختم کرنے، یا ہماری شہریت کو مشکوک بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی، تاہم اب تک کے تجربے سے یہ بات بھی دن کی روشنی کی طرح ظاہر ہے کہ غیر مسلم سیکولر پارٹیوں کو ہمارا وجود تو منظور ہے، پر ہم سے مذہبی اختلاف کی بنا پر ہماری قیادت منظور نہیں ہے اور فرقہ پرستوں کو تو اسلام اور مسلمانوں کا وجود ہی منظور نہیں ہے، اسی وجہ سے پہلے کو چھوٹا دشمن اور دوسرے کو بڑا دشمن کہا جاتا ہے۔

ہمارے ملک میں معاشی بدحالی اور ظلم وناانصافی کے باوجود، صرف مذہب کی بنیاد پر جس طرح دن بدن فرقہ پرستوں کی جڑیں مستحکم ہورہی ہیں اور ان کی شاخیں پھیل رہی ہیں، ایسے میں ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ چھوٹے دشمن کو گوارہ کریں، یا اسے بھی بڑے دشمن کی صفوں میں شامل ہونے کا موقع فراہم کریں؛ کیونکہ اگر اسے صرف اقتدار مقصود ہوگا تو اندیشہ ہے کہ وہ بھی فرقہ پرستوں کے خوف سے اور اقتدار کے لالچ میں ان کی گود میں جا بیٹھیں اور اپنی ہم قوم آر ایس ایس کے ہندوتوا نظریے کو کھلے دل سے قبول کرلیں، پھر تو میدان سیاست میں پنجہ آزمائی کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی، اس وقت آر ایس ایس کو اس سے کیا فرق پڑے گا کہ مرکز میں کانگریس کی حکومت رہے، یا بی جے پی کی، اور وزیر اعظم مودی ہوں، یا راہل، اسی طرح صوبائی حکومتیں بھی حسب حیثیت غیر مسلم پارٹیوں کے حوالے کردی جائیں گی تو پھر ہماری مسلم پارٹیاں اور مسلم قیادتیں کس کام کی رہیں گی؟ اور وہ بھی منتشر اور بکھری ہوئیں!

قبل اس کے کہ وہ بدترین دور آئے ہمیں پیش بندی کے طور پر درج ذیل باتوں کو سمجھنے اور ان پر ثابت قدمی کے ساتھ عمل کرنے کی ضرورت ہے:

ایک بات تو یہ ہے کہ سیکولر پارٹیوں سے سورج کی روشنی کی طرح سو فیصد نفع اٹھانے اور نقصان سے بچنے کی امید تو فضول ہے، البتہ بی جے پی حکومت کی شب تاریک میں ٹمٹماتے چراغ کی طرح اسے سنبھال کر رکھنے میں ہی ہمارا فائدہ اور مخالفت میں مزید نقصان ہے، اگر فرقہ پرست عناصر غالب نہ ہوتے، یا ان سے ہمارے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا، یا ان کے مد مقابل کانگریس کے علاوہ کوئی اور پارٹی اس سے زیادہ ہماری خیر خواہ ہوتی اور اس میں حکومت بنانے کی صلاحیت بھی ہوتی، یا کم سے کم ہماری صفوں میں اتحاد ہوتا اور ہمارے سیاسی قائدین آپس میں ہم خیال ہوتے، اور پھر ہماری طرف سے فرقہ پرستوں کے ساتھ ساتھ کانگریس وغیرہ کی بھی مخالفت اور اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی جاتی تو یقیناً قابل تحسین اقدام ہوتا؛ چونکہ اپنے ملک میں اور خاص طور پر موجودہ حالات میں بڑے دشمن سے بچنے کے لیے چھوٹے دشمن کو ڈھال بنانا ہماری مجبوری ہے؛ لہٰذا اسے غلامی اور تلوے چاٹنے سے تعبیر کرنا مناسب نہیں ہے؛ کیونکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آفتاب رسالت مآب ﷺ نے بھی شدت پسند دشمنوں کے مقابلے میں سیکولر ذہنیت کے مشرکوں کی ضرورت محسوس فرمائی تھی اور ان سے مستفید بھی ہوئے تھے؛ چنانچہ نبوت کے دسویں سال سفر طائف سے واپسی کے موقع پر آپ ﷺ کا داخلہ مکہ

مکرمہ میں بظاہر بہت مشکل تھا؛ لہٰذا غار حرا میں قیام فرمایا، اس وقت مکہ میں جاں نثار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اسد اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے اور اعلان خداوندی ''وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ '' کی شکل میں لوگوں سے آپ ﷺ کی حفاظت کا وعدہ بھی تھا، پھر بھی آپ ﷺ نے اسباب کے درجے میں اخنس بن شریق، سہیل بن عمرو اور مطعم بن عدی کے پاس یکے بعد دیگرے یہ پیام بھیجا کہ کیا میں آپ کی پناہ میں مکہ آسکتا ہوں؟ پہلے اور دوسرے نے تو انکار کردیا، مگر مطعم نے آپ کی فرمائش قبول کرلی اور اپنے بیٹے اور قوم کے لوگوں کو بلا کر یہ حکم دیا کہ ہتھیار لگا کر حرم کے دروازے پر کھڑے رہیں، میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے اور خود بھی اونٹ پر سوار ہوکر حرم کے پاس آ کھڑے ہوئے اور پکار کر کہا کہ اے گروہ قریش! میں نے محمد (ﷺ) کو پناہ دی ہے کوئی ان سے تعرض نہ کرے، اس طرح آپ ﷺ بسلامت حرم میں تشریف لائے، حجر اسود کو بوسہ دیا اور طواف کرکے بطور شکرانہ ایک دوگانہ ادا فرمایا، گھر تشریف آوری تک مطعم اور ان کے بیٹے آپ ﷺ کی حفاظت کرتے رہے، مطعم کے اسی احسان کی بنا پر، بدر کے دن بدر کے قیدیوں کے بارے میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتے اور ان گندوں کے بارے میں مجھ سے سفارش کرتے تو میں ان کی رعایت میں ان سب کو رہا کردیتا۔

(تلخیص از: فتح الباری شرح صحیح بخاری، بضمن حدیث نمبر: 4024، سیرت مصطفیٰ ﷺ: ?/???-???، مکتبہ احسان لکھنؤ، بحوالہ: طبقات ابن سعد، زاد المعاد، عیون الأثر)

دوسری بات یہ ہے کہ سیکولر پارٹیوں کی حمایت کریں، مگر اس حقیقت سے بھی آگاہ رہیں کہ کچھ فرقہ پرست گھس پیٹھی بھی وہاں موجود ہیں، جو آئے دن بی جے پی کی حمایت میں پلٹی مارتے رہتے ہیں؛ لہٰذا آنکھیں موند کر نہ رہیں؛ بلکہ دائیں اور بائیں پر نظر بھی رکھیں اور مستقبل کے لیے کوئی ٹھوس راہ عمل بھی تیار کریں، اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری مسلمانوں کا عملی اتحاد ہے، جو شریعت کا حکم ہے؛ لیکن وہ اتحاد نہیں، جو صرف مسلمانوں کے مفاد میں ہو؛ بلکہ وہ اتحاد جو پوری انسانیت کے نفع ونقصان کو سامنے رکھتے ہوئے کیا جائے؛ کیونکہ اعلان خداوندی کے مطابق ہماری پیدائش صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہوئی ہے۔ (آل عمران:110) جب اس جذبے کے ساتھ اتحاد ہوگا تو ہمارا نفع بھی تمام انسانوں میں عام ہوگا اور نقصان سے بھی ہر ایک کی حفاظت ہوجائے گی؛ لہٰذا بہتر ہوگا کہ پورے ملک میں اپنی جتنی بھی سیاسی پارٹیاں ہیں، ان کے قائدین پورے اخلاص، دور اندیشی اور ہوشمندی کے ساتھ بلاخوف وخطر آپسی ملاقات ومذاکرات کا سلسلہ شروع کریں، اپنی اپنی پارٹی کو باقی رکھتے ہوئے، یا بعض کو بعض میں ضم کرکے سیاسی طور پر متحد ہوں، جس طرح سیکولر پارٹیوں نے مسلمانوں کو اپنی پارٹیوں میں شامل کیا ہے، اسی طرح وہ بھی برادران وطن کو شریک کریں، مشوروں میں بزرگان دین اور باعمل علمائے کرام کو بھی مدعو کریں کہ وہ انبیائے کرام علیہم السلام کے وارث ہیں، پھر باہمی مشورے سے، ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر، انسانیت کے مفاد میں اور رضائے الٰہی کی خاطر اپنا ایک مرکزی سیاسی قائد بھی منتخب کریں اور ایک متفقہ سیاسی منشور بھی بنائیں اور جاری کریں؛ تاکہ مسلم قیادت اور طریقہ سیاست کے حوالے سے ملت اسلامیہ میں جو اضطراب وبے چینی کا ماحول قائم ہے اور نامناسب بیان بازی کا سلسلہ بھی جاری ہے، ان کا سدباب ہوسکے اور تمام مسلمان پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ اپنے متحدہ ایجنڈے کے مطابق متحد ہوکر خود بھی کام کریں اور برادران وطن کو بھی اس سے جوڑنے کی کوشش کریں۔

نوٹ: تقدیر اگرچہ ایک اٹل حقیقت ہے، مگر ہم تو تدبیر کے مکلّف ہیں اور کامیابی کا مالک اللہ ہے؛ اس لیے ہمیں اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

رشدہ شاھین، ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

جیلانی بانو کے ناولوں میں مسائلِ نسواں کی بازگشت

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف اقوام ایک ساتھ سکونت پذیر ہیں جس کی وجہ سے یہاں کے مسائل بھی الگ الگ ہیں۔ مثلاً یہاں کی بڑھتی ہوئی آبادی اور تعلیم کا فقدان ایک اہم مسئلہ ہے حالاں کہ موجودہ دور میں نئی نسل کا رجحان تعلیم کی طرف ضرور ہوا ہے لیکن ابھی بھی گاؤں، دیہات میں پچھڑی ہوئی آبادی میں تعلیم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی طرح غربت، بیکاری، باہمی کشیدگی، اجتماعی و انفرادی زندگی میں بے راہ روی، نسلی تفریق، ذات پات، چھوت چھات، خواتین کے مسئلے بھی اہم ہیں۔ عورت سماج کا ایک اہم رکن ہے لیکن سماجی حیثیت سے وہ اب بھی بہت پست ہے۔ ہندوستانی عورت صدیوں سے مرد کی نگراں اور سماجی اعتبار سے دبی کچلی ہوئی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان میں رائج مختلف مذاہب اور اس کے رہنماؤں و رہبروں نے عورت کا رتبہ کم کر دیا تھا البتہ ویدک دور میں عورتوں کو آزادی حاصل تھی اور وہ سماج کا ایک اٹوٹ حصہ مانی جاتی تھیں۔ اگر مختلف مذاہب میں خواتین کی سماجی حیثیت کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں عورتوں کی حالت بہت بدتر تھی وہ اپنے حقوق کو نہ ہی جانتی تھیں اور نہ ہی اس کے لیے آواز اٹھا سکتی تھیں۔ یہ رائے عام تھی کہ گھر کی چار دیواری ہی عورت کا مقدر ہے، وہ خود مختار نہیں ہے، شادی کرنا اور ماں بننا اس کی زندگی کا مقصد ہونا چاہیے۔ شوہر اور بیٹوں سے ہی اس کی سماج میں عزت و احترام ہے۔

آخر کار ایک وقت آیا جب سماج کے روشن خیال طبقے نے یہ محسوس کیا کہ سماج میں مکمل سدھار اسی وقت ممکن ہے جب تک سماج کے دوسرے اہم جز یعنی خواتین کی حالت میں سدھار پیدا نہ کیا جائے۔ عورتوں کو خود اس بات کا احساس دلایا جائے کہ سماج میں ان کا کیا مقام ہے۔ ادیبوں نے سماج کی بہتری کے لیے خواتین کے مسائل کو اپنا موضوع خاص بنایا اور اپنے تخلیقات کے ذریعے ان کے اخلاق، تہذیب و تمدن اور طور طریقوں کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

شہر حیدرآباد اپنی بیش بہا خصوصیات کی بنا پر اپنی ایک منفرد پہچان رکھتا ہے۔ ابتدا سے ہی یہ شہر اپنی الگ زبان، تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ اردو زبان نے اپنا ارتقائی سفر اسی سرزمین سے شروع کیا اور اس کی ترقی میں یہ سرزمین بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ اردو ادب کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔ حیدرآباد کے حکمرانوں کو اردو سے خاص شغف تھا، وہ خود صاحب طرز شاعر و ادیب تھے اور ادیبوں کی سرپرستی ان کا شیوہ تھا۔ یہاں کی خاک سے بے شمار شعرا و ادبا نے جنم لیا جنھوں نے ہر دور میں اردو ادب کی خدمت کی۔ پہلے حیدرآباد کا ماحول عورتوں کے لیے سخت گیر تھا۔ اکثر گھرانوں میں عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر نکلنا ممنوع تھا۔ لیکن بدلتے وقت کے ساتھ اس رویے اور قدامت پسند میں بدلاؤ آیا۔ انیسویں صدی میں حیدرآباد میں تحریک نسواں کا آغاز ہوا جس کا اثر معاشرتی و تمدنی زندگی پر راست یا بلاواسطہ طور پر پڑا۔ اس تحریک کی وجہ سے یہاں کی خواتین کو حوصلہ ملا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے نہ صرف تعلیم حاصل کی بلکہ باقی لوگوں کو بھی اس طرف راغب کیا۔ اسی طرح انہوں نے سماجی و معاشرتی پہلو پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔

ادب کے میدان میں بھی اپنے پیر مضبوط کیے اور اس طرح اس سرزمین نے بہت سی خواتین ادیبوں کو جنم دیا۔ انہوں نے اپنے فن پاروں میں مختلف موضوعات پر بحث کی ہے۔ اپنی تخلیقات کے ذریعے ادب میں اپنی الگ شناخت بنائی۔ ادب کے ہر میدان میں خواتینِ دکن نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے۔ حیدرآباد کی خواتین ناول نگاروں نے تقریباً بیسویں صدی کے نصف آخر میں ناول لکھنے شروع کیے اور تب سے آج تک یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔ یہاں کی کئی خواتین ناول نگار آج بین الاقوامی شہرت کی مالک

ہیں۔ اپنے فن اور موضوع دونوں اعتبار سے اس صنف کو جلا بخشی ہے۔ ان ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں سماج کے مختلف مسائل بالخصوص عورتوں کے مسائل کو اولیت دی ہے۔ اپنے ناولوں کے ذریعہ عورتوں کی تعلیم وتربیت، سماجی و اخلاقی اور معاشرتی خامیوں کو دور کرنے کی بھی سعی کی ہے۔ تمام خامیوں اور برائیوں کی جڑ عورتوں کا ناخواندہ ہونا ہی مانا ہے۔ اس کے علاوہ ان ناول نگاروں نے سماج کے فرسودہ رسم ورواج کی طرف بھی لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

موجودہ دور میں خواتین ناول نگاروں میں جیلانی بانو کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں نے ''ایوان غزل'' اور ''بارش سنگ'' جیسا مشہور ناول اردو ادب کو دیا۔ اپنی تخلیقات کے ذریعہ سماج کے مختلف مسائل اور خصوصی طور پر حیدرآباد کی معاشرتی، سیاسی اور تہذیبی وثقافتی زندگی کے ساتھ ساتھ عورت کی حیثیت اور ان کی زندگی کے مختلف مسائل کو اجاگر کیا ہے۔ انہوں نے جس عہد میں ہوش سنبھالا وہ جاگیردارانہ ماحول و معاشرے کی ٹوٹتی بکھرتی روایتوں اور قدروں، سیاسی وسماجی تغیرات اور تحریک آزادی کا دور تھا۔ اس دور کے مسائل سے وہ حد درجہ متاثر ہوئیں۔ جب انہوں نے لکھنا شروع کیا تو اپنی تمام فن کارانہ صلاحیتوں کو اپنی تخلیقات میں سمو دیا اور سماج کے مختلف مسائل و زندگی کے نشیب وفراز کو اپنے فن کے ذریعے عوام سے روشناس کرایا۔ جیلانی بانو کے دو مشہور ناول ایوان غزل اور بارش سنگ ہیں۔ اپنے دونوں ناولوں میں سماجی و سیاسی سطح پر خواتین کے ساتھ ظلم و زیادتی کو پیش کیا ہے۔ جیلانی بانو نے خواتین پر ہونے والے گھریلو تشدد کو بے باک انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے ناولوں میں کم سن لڑکی، نوجوان خاتون، بیوی، ساس اور ہر وہ خاتون رشتہ جو کسی نہ کسی طرح انسانی رشتوں سے منسلک ہوتا ہے پریشان تکلیف دہ نظر آتا ہے۔ ان کے ناولوں کی خواتین کردار گھریلو زندگی، خاندانی سازشوں، سماجی نابرابری کا شکار ہیں جو فرسودہ معاشرے اور مطلب پرست گھریلو خاندانی نظام کی پول کھولتی ہیں۔ ایوان غزل کے موضوع کے بارے میں مشرف علی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''اس ناول میں زوال خوردہ جاگیردارانہ نظام سے پیدا شدہ حالات وحقائق کو یکجا کر کے انہوں نے اس معاشرے کی کھوکھلی روایات اور اقدار کو بے نقاب کیا ہے۔ جہاں عورتوں کے حالات و مسائل، ضعیف الاعتقادی، مذہبی ریاکاری، فرسودہ رسم ورواج، مشترکہ تہذیب و کلچر، نئی اور پرانی تہذیبوں میں کشمکش، مظلوموں اور کسانوں کا استحصال، استحصالی نظام کے بطن سے پیدا ہونے والی نئی قوتیں اور ان کی مصلح بغاوت کی حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔'' (مشرف علی، جیلانی بانو کی ناول نگاری کا تنقیدی مطالعہ، ص:33)

یہ ناول 1976 میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں جاگیردارانہ معاشرت وتہذیب وتمدن کی مٹتی ہوئی ایک تصویر پیش کی ہے۔ مسلم گھرانے میں خواتین کے ساتھ ہونے والی نسلی وجسمانی تشدد کی داستان بیان کی گئی ہے۔ جیلانی بانو مسلم گھرانوں میں پنپنے والے ان مسائل کو بے پردہ کیا ہے جو شائد بیسویں صدی کے وسط میں منظر عام پر نہیں آتے تھے اور نہ ہی کسی اخبار یا رسائل کی سرخی بنتے تھے۔ یہ ناول آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد تک کے چند برسوں کی حیدرآبادی تہذیب وثقافت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ جاگیردارانہ معاشرے میں عام طور پر ایک سے زائد شادی کرنا، داشتائیں رکھنا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔ شادی سے قبل اور شادی کے بعد غیر عورتوں سے تعلق رکھنا معیوب نہیں تھا۔ لیکن ان عورتوں اور داشتاؤں سے ہونے والی اولادوں کو ان کے حق سے محروم کر دیا جاتا تھا اور وہ اچھوت کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ اس نظام میں لڑکیوں کی پیدائش کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ معاشرے کی عورت اس قدر گھٹن اور استحصال کی شکار تھیں کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے یہاں کوئی مجبور اور بے بس ہستی جنم لے۔ اس کے متعلق اقتباس ملاحظہ ہو:

''ہر عورت کو انسان کی تخلیق کا اختیار اللہ میاں سونپ دیتے ہیں مگر کوئی عورت یہ نہیں چاہتی کہ اس کے بطن سے اسی کی طرح مجبور اور بے بس ہستی جنم لے۔'' (ایوان غزل، ص:65)

ایوان غزل میں اعلیٰ طبقے کی عورتوں کی دوہری زندگی کو بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس ناول میں ایک طرف روایتی جاگیردارانہ معاشرت میں عورت کی حیثیت اور اس کے کرب

کی حقیقی تصویر ملتی ہے تو دوسری طرف انگریزی سامراجیات کے طفیل میں مغربی اقدار اور جدید طرز زندگی نے جو اثرات اس طبقے کی عورتوں پر ڈالے تھے اور اس کے پس پردہ ان کے استحصال کی جو نئی بساط بچھائی تھی اس کی بھی جھلک ملتی ہے۔

ایوان غزل بنیادی طور پر ایک سماجی ناول ہے جس میں سلطنت آصفیہ کا زوال اور آزادی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ ناول میں مصنفہ نے جاگیردار طبقے کی زندگی کی منظر کشی سے زیادہ ان کی شخصیات کے اندرونی محرکات اور اس سے پیدا شدہ عمل کو مدنظر رکھا ہے۔ اس دم توڑتے جاگیردارانہ ماحول میں کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے ان کا مقصد دولت حاصل کرنا اور عیاشی کرنا ہے اور اس کے حصول کے لیے وہ رشتوں کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ غلاموں اور عورتوں پر ظلم کیے جاتے ہیں۔ اس مخصوص نظام میں عورت بے زبان مخلوق ہے جو کبھی بی بی بن کر خاموشی سے زندگی کا زہر پیتی ہے، کبھی لنگڑی پھوپھو کی طرح معذور کر دی جاتی ہے۔ کبھی چاند اور غزل کی طرح چمکتے سکوں کی طرح ان کا استعمال کیا جاتا ہے اور ان کی زندگی تلوار کی دھارے سے ہو کر گزرتی ہے۔

ایوان غزل میں جاگیردارانہ نظام کے استحصال کا بالکل ایک نیا روپ نظر آتا ہے۔ اجالا بیگم ایک باندی کو مجبور کر کے اس کا نکاح اپنے شوہر سے کروا دیتی ہے کیوں کہ اس باندی کے ناجائز تعلقات غلام رسول سے تھے جس کی وجہ سے اس کا پیر بھاری ہو گیا تھا۔ اجالا بیگم لاولد خاتون تھیں اور اس طرح اس باندی سے جو اولاد جنم لیتی قانونی طور پر اس کے شوہر احمد حسین کی وارث بن جاتی۔ اس خبر سے واحد حسین کافی اداس ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی نظر احمد حسین کی جائداد پر تھی۔ ایوان غزل دراصل ایک حویلی کا نام ہے جس کے مکینوں کی کہانی جیلانی بانو نے بیان کی ہے۔ اس ناول میں ہمیں کئی گھرانوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ پہلا ایوان غزل میں رہنے والوں میں واحد حسین اور ان کی بیوی، اس کے علاوہ ان کا بیٹا راشد اور دو بیٹیاں بشیر بیگم اور بتول بیگم ہیں۔ واحد حسین کے ایوان غزل کی طرح مسکین علی شاہ کا گھرانا ہے جو الف لیلہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ دراصل واحد حسین کی چھوٹی بیٹی بتول بیگم کی سسرال ہے۔ یہ گھرانہ مذہبی رسم و رواج سے بھرا ہوا ہے یہاں ہر بات کے لیے اصول اور ضابطے ہیں اور تمام قاعدے قانون کی پابندی لازمی ہے۔ یہاں کی خواتین کی حالت ایوان غزل کی خواتین سے بھی زیادہ بدتر ہے۔ یہاں کی عورتیں بے شمار پابندیوں کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ ایسے ماحول میں ان کا دم گھٹتا ہے اور وہ راہ فرار تلاش کرتی رہتی ہیں یا پھر زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ایسے فرسودہ رسم ورواج اور مذہبی ریاکاری والے معاشرے میں عورتوں کے جو مسائل درپیش تھے جیلانی بانو نے اس کی حقیقی تصویر پیش کی ہے۔

ان دونوں گھرانوں کے برعکس حیدر علی کا گھرانہ ہے جو حد سے زیادہ ماڈرن اور مغربی تہذیب کا مقلد ہے۔ یہ واحد حسین کی بڑی بیٹی بشیر بیگم کا سسرال ہے۔ یہاں شراب پینا، عورتوں اور مردوں کا ایک ساتھ کلب جانا، تھیٹر میں کام کرنا، غیر مردوں کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومنا وغیرہ فخریہ سمجھا جاتا ہے۔ اعلیٰ طبقے کا استحصال نچلے طبقے سے مختلف ہے۔ اس کا استحصال ڈیوڑھیوں میں نہیں بلکہ کلبوں، مشاعروں، اور اداکاری کے اسٹیج پر ہوتا ہے۔ مغربی تہذیب کے ذریعہ خواتین کا استحصال کی جو نئی بساط بچھائی گئی تھی اس گھرانے کی خواتین اس کا شکار تھیں۔

ایوان غزل میں موجودہ تمام نسوانی کردار عورت کے مسلسل استحصال کی عکاسی کرتے ہیں یہ سلسلہ نسل در نسل چلا آتا ہے۔ جیلانی بانو نے تین نسلوں کی عورت کے استحصال کو ناول میں پیش کیا ہے۔ پہلے بی بی جو غزل اور چاند کی نانی ہیں اس کے بعد ان دونوں کی ماں اور پھر وہ دونوں یعنی غزل اور چاند۔ بی بی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی تھیں لیکن واحد حسین نے زبردستی ان سے شادی کی۔ اپنی اچھی پرورش کی وجہ سے بی بی نے اپنی پوری زندگی ظلم سہتے خاموشی سے گزاری حالاں کہ دل سے کبھی واحد حسین کو اپنا شوہر تسلیم نہیں کیا۔

غزل جو بتول کی لڑکی ہے ناول کی ہیروئن اور شاہین جو راشد کا بیٹا ہے ہیرو کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں مرکزی کردار ہیں غزل اپنی چھوٹی سی زندگی میں ہی جنسی بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے اور کئی عشق کرتی ہے۔ لیکن جب وہ نصیر سے محبت کرتی ہے تو اس کی زندگی یکسر بدل جاتی ہے وہ نصیر سے شدید محبت کرنے لگتی ہے اور اس پر

اپنی عفت وعزت سب کچھ نچھاور کر دیتی ہے لیکن اس کے برعکس نصیر صرف اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور اس سے جھوٹی محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہاں تک اپنی محبت کا یقین دلانے کے لیے غزل کو ہیرے کی انگوٹھی بھی دیتا ہے۔ غزل اس پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتی ہے اور جب شادی کی بات کرتی ہے تو نصیر مکر جاتا ہے۔ غزل کا خاندان مذہبی ریاکاری سے بھرا ہوا ہے اس طرح اپنی جوانی داغدار کر لینا غزل کے لیے ایک حادثہ بن جاتا ہے سب اس کو جھوٹی ہانڈی سمجھتے ہیں اور کوئی بھی اس سے شادی کرنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ لیکن شاہین ان دقیانوسی باتوں کو نہیں مانتا اور غزل سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔

غزل کی بے راہ روی میں اس میں زیادہ تر اس کے دقیانوسی ماحول کا بھی ہاتھ رہا ہے۔ وہ زندگی بھر تشنگی کا شکار رہی، اس کی والدہ بھی خانگی تشدد کا شکار رہتی تھیں۔ چنانچہ بچپن سے ہی غزل کے ذہن پر باپ کی سخت گیری اور ماں کی بے چارگی کی تصویر ذہن میں بن گئی۔ ماں کی بے وقت موت، باپ کی حقارت بھری نظر اس کے علاوہ ایوان غزل کا تضحیک آمیز رویہ، جس کی وجہ سے غزل کو شدید جزباتی محرومی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر اس شخص کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے جو اس سے تھوڑی بہت اپنائیت جتاتا ہے۔ اپنی اس نفسیاتی کمزوری کے سبب زندگی میں اسے کئی دھوکے ملتے ہیں۔ نتیجتاً غزل غلط راہ پر پڑ جاتی ہے۔ اس کردار کا جائزہ لینے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں آنے والا ہر مرد اسے اپنی ضرورتوں کے لیے استعمال کرتا ہے اور مطلب پورا ہونے کے بعد اس کو تڑپتا ہوا مرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔

غزل کی طرح ایوان غزل کا دوسرا قابل رحم نسوانی کردار چاند کا ہے جو بشیر بیگم کی بیٹی ہے۔ اس کے والد ترقی پسند خیالات کے مالک تھے ان کا گھرانہ ماڈرن تھا اس لیے انہوں نے چاند کو ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی غلط راہ پر چل پڑتی ہے اور اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتی۔ لیکن ماں کی اچانک موت کے بعد اس کی زندگی ہی بدل جاتی ہے اور قسمت اسے ایوان غزل کی دہلیز پر پہنچا دیتی ہے جہاں کا گھٹن بھرا ماحول چاند کے لیے تکلیف دہ تھا وہاں وہ جنسی ہوس کا نشانہ بنتی ہے۔ اس کے ماموں راشد نے اپنی چالاکی اور عیاری سے اسے اپنی ترقی کا زینہ بنایا اور جب وہ ترقی کی بلندیوں تک پہنچ گئے تو انہیں چاند فضول شئے لگنے لگی۔ کیوں کہ چاند ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو جاتی ہے اور صرف 26 سال کی عمر میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔

غزل اور چاند اگرچہ دو الگ کردار ہیں لیکن دونوں کے حالات ایک ہیں، دونوں کو ہی اپنے ننہال ایوان غزل میں آنا پڑا۔ یہاں کے مکینوں نے دونوں خالہ زاد بہنوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ تینوں خاندان کی عورتوں کو شروع سے ہی مسائل اور پریشانیوں میں مبتلا بتایا گیا ہے چاہے وہ واحد حسین کا قدامت پرستی کا نوابی گھرانہ ہو یا پھر مسکین علی شاہ کا گھرانہ یہاں پر خواتین کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک رکھا جاتا تھا۔ حیدر علی کا گھرانہ ترقی پسند ذہنیت کا مالک تھا مگر انہوں نے آصفیہ سلطنت کے خلاف بغاوت بلند کی اور جان بچانے کے لیے نلگنڈہ کے پہاڑی علاقوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ ایسے میں انہوں نے نہ ہی اپنی بیوی کی کوئی خبر لی اور نہ ہی اپنی بیٹی چاند کی۔ ان تینوں گھرانوں میں خواتین بے یارومددگار، بے سہارا، مجبوری میں اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھیں۔ ناول جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے اس کے نسوانی کردار ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اترتی جاتی ہیں۔

چاند موت سے پہلے اپنی خالہ زاد بہن غزل کو بھی غلط راستے پر چلتے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ وہ غزل کو اس مطلب پرست دنیا سے محفوظ رہنے کی تدبیر بتاتی ہے:

''میں تو چھبیس برس میں موت کے کنارے کھڑی ہوں لیکن غزل تو ابھی خود چلنا چھوڑ دے۔ اپنی تقدیر بنانے کا حوصلہ ہر عورت میں نہیں ہوتا۔ اس لیے اپنی باگیں بی بی کے ہاتھوں میں تھما دے ورنہ راشد ماموں خالو پاشا تجھ سے اپنی کامیابیوں کے قفل کھولیں گے اور تجھے پھینک دیں گے۔'' (ایوان غزل، ص: 291)

لیکن غزل پوری طرح اس خاردار راستوں میں الجھ چکی تھی جہاں پر موت کے علاوہ کوئی راستہ نہ تھا۔ ناول میں ایک چاند

کی موت ہی المناک نہیں ہے بلکہ اس کی خالہ بتول بیگم، والدہ بشیر بیگم، نانی بی بی بھی ان المناک موت کا شکار ہو چکی تھیں۔ جنھوں نے زندگی بھر مصائب و پریشانی کا سامنا کیا۔

خواتین کردار ایک طرف تشدد کا شکار ہیں تو دوسری طرف کئی واقعات ایسے ہیں جن میں خواتین ہی خواتین کے لیے مضر ثابت ہوئی ہے۔ ایوان غزل میں یہی ایک کمزوری واضح نظر آتی ہے کہ اس حویلی میں خواتین میں کہیں بھی اتحاد و اتفاق نہیں تھا۔ یہ تمام کردار استحصال کا شکار ہوتیں پھر ایک دوسرے کو استحصال کا شکار بناتیں۔ مسلم معاشرے کی زبوں حالی کی ایک اہم وجہ خواتین کی جہالت، آپسی نا اتفاقی، ایک دوسرے پر نفسیاتی برتری، سماجی و اسلامی اقدار کی پامالی، دینی و دنیاوی تعلیم سے دوری ہے۔ ایوان غزل میں یہی برائیاں خاتون کرداروں میں واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ ناول کا مرکزی کردار غزل بھی ان ہی نا اتفاقیوں اور ناانصافیوں کا شکار ہوتی ہے اور بالآخر خودکشی کے ذریعے اس ایوان غزل سے نجات پاتی ہے۔

جیلانی بانو نے ایوان غزل میں اونچے طبقے کی عورتوں کی دوہری زندگی کو پیش کرنے کے ساتھ نچلے طبقے کی عورتوں کے مسائل کا بھی ذکر کیا ہے۔ نچلے طبقے کی عورتیں اور لڑکیاں جن کے والدین کی معاشی و سماجی حالت ٹھیک نہ تھی وہ جاگیرداروں و نوابوں کے یہاں ان کا دل بہلانے کے لیے زبردستی لائی جاتی تھیں۔ وہ کھلونے کے مانند محل میں رہتی تھیں اور ان کو عیاشی و جنسی تسکین کا محض ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ان سے ہر طرح کے گھریلو کام بھی لیے جاتے تھے۔ اس استحصال کی حقیقی عکاسی جیلانی بانو نے طنزیہ لہجے میں کی ہے:

''ریزیڈنٹ نے الزام لگایا کہ حضور کی حرم سرا میں عورتوں پر بڑا ظلم وستم ہوتا ہے.....تو کیا ظلم وستم ہوتا ہے.....کچھ نہیں.....اس وقت قاعدہ تھا کہ سب ہی نواب دل بہلانے کے لیے خوبصورت لڑکیاں محل میں شامل کر لیتے تھے۔ یہ غریب لڑکیاں ماں باپ کے یہاں فاقے کرتیں یا کسی نکمے جاہل آدمی سے بیاہی جاتی تھیں۔ لیکن محلوں میں انہیں شاندار گھر ملتے۔ ان کے نام پر جاگیریں اور منصب ہو جائے تو ان کی اولاد کا مستقبل درخشاں ہو جانا تھا۔ ان لڑکیوں کے ماں باپ الگ بخشش سے اپنی قسمت سنوار لیتے تھے۔'' (ایوان غزل، ص:26-125)

جیلانی بانو نے ایوان غزل میں عورت کا دو پہلو پیش کیا ہے ایک یہ کہ عورت مظلوم، محکوم اور بے بس ہوتی ہے تو دوسری طرف اس کے اندر اتنی قوت بھی ہوتی ہے کہ وہ اگر استحصالی سماج کا نشانہ بنتی ہے تو باغی بن کر مردانہ ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بھی بلند کرتی ہے۔ ان میں گوہر پھوپھو (لنگڑی پھوپھو) اور چاند کا کردار اہم ہے جو بغاوت کرتی ہیں مگر ان دونوں کرداروں میں سے صرف گوہر پھوپھو ہی اپنی زندگی کو محفوظ رکھ پائیں جبکہ چاند گھریلو تشدد، مطلب پرستی کا شکار ہو گئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

''ایوان غزل میں عورت کو ایک الگ مخلوق ماننے کے بجائے اس مردانہ بالا دستی والے معاشرے میں عام انسانوں کا ہی ایک حصہ تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نظام میں یہ عورت دوسری سبھی عورتوں کی طرح کمزور، مجبور اور محکوم ہے۔ دوسری جانب وہ بہت حساس، بیدار ذہن، نڈر اور باغیانہ طبیعت کی حامل بھی ہے۔'' (مشتاق احمد وانی، اردو ادب میں تانیثیت، ص:534)

الغرض جیلانی بانو نے جاگیردارانہ ماحول و معاشرے میں کوٹھیوں، کلبوں اور تھیٹروں میں عورتوں کے استحصال، ان کی بے بسی، ذہنی گھٹن اور مظلومیت کی حقیقی تصویر اس ناول کے ذریعے پیش کی ہے۔

بارش سنگ جیلانی بانو کا دوسرا اہم ناول ہے جو 1975 میں منظر عام پر آیا۔ تلنگانہ پس منظر کے تحت یہ ناول لکھا گیا ہے۔ اس میں دیہی علاقوں میں سکونت پذیر غریب کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کے حالات و مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔ اس ناول کا موضوع خصوصاً عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کا استحصال ہے۔

اس ناول کی ابتدا جیکٹ پلی گاؤں سے ہوتی ہے جس کے معنی ہیں اندھیری نگری یعنی اس گاؤں میں صبح تو ہوتی ہے لیکن دیر سے۔ وہاں کچھ ایسے بدنصیب گھرانے بھی ہیں جہاں کبھی

بھی صبح نہیں ہوتی یعنی مایوسیوں اور پریشانیوں میں انہیں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ گاؤں کے ایک غریب کسان مستان کا گھرانہ بھی ایسی ہی زبوں حالی کا شکار ہے۔ اس کا گھر جیکٹ پلی کے کسانوں کی سماجی و معاشی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ دوسری طرف وینکٹ ریڈی اور رنگا ریڈی کا کردار جاگیرداروں کے جبر واستحصال کی عکاسی کرتے ہیں۔ دونوں مکروفریب سے کسانوں کی زمین پر قبضہ کر رکھا ہے اور پھر انہیں کو اپنی مکاریوں اور چالبازیوں سے بندھوا مزدور بنا کر ان زمینوں پر کام کرواتے ہیں۔ ان دونوں کا ظلم یہیں تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنی عورتوں کو بھی اپنے گھروں میں غلام بنا کر رکھتے ہیں اور ان پر مختلف قسم کے ظلم وستم کرتے ہیں۔ اسی طرح غریب کسانوں کی بیٹیوں کو اپنے فائدے کے لیے سرکاری عہدیداروں کو تحفے میں پیش کرتے ہیں اور جب جی چاہا اپنے گھروں پر کام کرنے کے لیے بلا لیتے ہیں اور ان کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہ عورتیں اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کی وجہ سے جاگیرداروں کی ہوس کا نشانہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ طبقے کی عورتوں کو محض جنسی تسکین کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ غریب کسان اپنی غریبی و مجبوری کی وجہ سے ان ساری حقیقتوں کو جانتے ہوئے بھی خلاف احتجاج کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ وہ ہمارے داتا ہیں اور ان کی حکم عدولی کرنا خلاف جرم ہے۔

مستان کی بیٹی کو وینکٹ ریڈی اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ لیکن بیٹی کی عصمت کی پامالی کے باوجود مستان کے اندر غصے کی لہر نہیں اٹھتی بلکہ وہ اپنی بیٹی کو ہی چپ رہنے کی نصیحت کرتا ہے:

''چپ بٹیا چپ..... سیٹھ لوگاں سن لیں گے۔ مستان ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اس نے خواجہ بی کی آنکھیں پوچھیں، کپڑے ٹھیک کیے۔ اماں کو کچھ نکو بول۔ تیرے بھائی سن لیں گے، سمجھ گئی نا۔ جا اب تو خود گھر چلی جا، مجھے ریڈی کے یہاں بہت کام ہے۔ خواجہ بی نے جلدی جلدی ریڈی کے گھر جانے والے باپ کو دیکھا۔ اماں ٹھیک بولتی ہے یہ تو ریڈی کا کتا ہے۔'' (بارش سنگ، ص: 27)

اگر کوئی ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا تو ان کو سخت سے سخت سزا بھگتنی پڑتی تھی۔ جاگیردارانہ سماج نے نچلے طبقے میں اس قدر خوف پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے حق وانصاف کے لیے آواز اٹھانے سے بھی گھبراتے تھے۔ اس نظام میں اعلیٰ طبقے کی عورتوں کا حال بھی کچھ ٹھیک نہ تھا ان کی حالت بھی نچلے طبقے جیسی ہی تھی۔ مردوں کے حکم کی تابعداری کرنا ان کا فرض تھا اور انہیں ان کی بے راہ روی کے خلاف بولنے کی کوئی اجازت نہیں تھی۔ مجبوراً وہ ان کے ظلم وستم کا نشانہ بنتی رہیں۔

وینکٹ ریڈی کا گھرانہ ساہوکاروں کی نمائندگی کرتا ہے۔ رتنا اس کی بیوی ہے جو وینکٹ ریڈی کی موت کے بعد اس کے بھائی ملیشم ریڈی کے ہوس کا شکار بنتی ہے۔ اردو ناولوں میں عورتوں کی مختلف مسائل کا ذکر کیا گیا ہے اس میں ایک اہم مسئلہ طوائف کا ہے۔ جیلانی بانو نے رتنا کے کردار کے ذریعے سماج کے اس گھناؤنے پیشے کا ذکر کیا ہے۔ حالاں کہ رتنا شروع سے اس پیشے میں نہیں تھی اسے زبردستی اس میدان میں ڈھکیلا گیا تھا۔ کوئی بھی طوائف اپنی مرضی سے اس پیشے کو نہیں اپناتی اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی ایسی وجہ ہوتی ہے جس سے مجبور ہو کر اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے اس دھندے میں آتی ہے۔ رتنا کی زندگی اس وقت یکسر بدل جاتی ہے جب اس کے شوہر وینکٹ ریڈی کی موت ہوتی ہے۔ وینکٹ ریڈی بھی کئی معصوم عورتوں اور لڑکیوں سے زبردستی کر چکا تھا اس کی موت کے بعد اس کے کرتوتوں کی سزا اس کی بیوی کو بھگتنی پڑی۔ ملیشم ریڈی نہ صرف اس سے اپنی جنسی ہوس پوری کرتا ہے بلکہ اسے اپنے ساتھ شہر لے جاتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے رتنا کو بڑے بڑے عہدیداروں کے بستر کی زینت بناتا ہے۔ وہ رتنا کو اپنے کاروبار کی ترقی کے لیے ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ ملیشم رتنا کی زندگی طوائفوں سے بھی بدتر کر دیتا ہے۔

مختصراً جیلانی بانو کے دونوں ناولوں کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ جاگیردارانہ سماج میں خواتین خواہ کسی بھی طبقے کی ہوں ان کی حیثیت سماج میں بالکل پست تھی اور وہ بے زبان مخلوق کی طرح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھی۔

محمد عبدالمعید ریسرچ اسکالر فارسی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

دکن میں فارسی زبان میں تاریخ نویسی اور مورخین کی خصوصیات

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور اسلامی حکومت کے قیام کے بعد سے فارسی زبان حکمرانوں اور برسر اقتدار طبقہ کی زبان رہی۔ ہندوستان میں اکثریت ان مسلمانوں کی تھی جو وسط ایشیاء ایران افغانستان ازبیکستان' تاجیکستان اور ترکی سے یہاں آئے تھے اور اپنے ساتھ فارسی زبان کو بھی ساتھ لائے تھے۔

سیاسی اقتدار کے ساتھ ساتھ فارسی نے تہذیب وتمدن اور ثقافتی میدان میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں برتری حاصل کرلی۔لیکن ہندوستان کے عوام کی اکثریت فارسی سے نابلد تھی۔سوائے معدودے چند افراد کے یا اس اقلیت کے جس نے ملازمتوں کے حصول یا سیاسی مقاصد کے لئے حکمران طبقے اور عوام کے درمیان حد فاصل قائم کردی حکمران طبقے نے اپنے سیاسی مفادات کے تحفظ اور سیاسی فوائد کے لئے اس بات کی کوشش کی کہ فارسی کے علاوہ دوسری زبانوں اور بولیوں کے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم نہ کئے جائیں چونکہ دربار کی سرپرستی صرف فارسی کے لئے تھی اس لئے اس نے ترقی کی لیکن اس کی جڑیں عوام میں مضبوط نہیں ہوئیں۔

زبان کے اس فرق کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکمران طبقے اور رعایا میں دوری ہوگئی۔اس لئے حکمران طبقے کے لئے یہ دقت طلب مسئلہ تھا کہ وہ عوام سے براہ راست گفتگو کرکے ان کے مسائل یا ان کی مشکلات سے آگاہ نہیں ہوسکتے تھے زبان کے فرق نے حکمران اور رعایا میں ہم آہنگی نہیں ہونے دی اور ہندوستان کی اکثریت میں یہ احساس قائم رہا کہ ان پر غیر ملکی حاکم کررہے ہیں فارسی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر اعلی عہدیدوں اور مناصب پر وہی لوگ فائز ہوتے تھے جن کی مادری زبان یا تو فارسی تھی یا جو حصول ملازمت کے لئے اسے سیکھتے تھے۔

اہل ایران جو ہندوستان میں بہتر ملازمتوں کے حصول کی خاطر یہاں آتے رہتے تھے۔حکومت کے اعلی عہدوں پر یہی لوگ فائز ہوتے تھے اور فارسی نہ جاننے والے یا کم جاننے یا کم جاننے والے ان ملازمتوں سے محروم رہتے تھے۔

تاریخ میں یہ اصول عام رہا ہے کہ جب کسی ملک پر غیر ملکی قابض ہوجاتے ہیں تو مفتوح قوم کا ایک طبقہ فاتح سے مفاہمت کرکے اس کے ساتھ اقتدار میں شریک ہوجاتا ہے۔ چنانچہ سکندر لودھی کے زمانے میں کایستھوں نے فارسی زبان سیکھنی شروع کی تاکہ حکومت کی ملازمتیں انہیں مل سکیں۔ان کی فارسی زبان دانی کے باوجود بجائے اس کے کہ ان کی قدر ہوتی، ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی فارسی میں ہینگ کی بو آتی رہی۔ اس کے پس منظر میں بنیادی بات یہی تھی۔

تاریخ تہذیب وتمدن کا ایک ایسا آئنہ ہے جس میں انسانیت کے خدوخال اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ بڑی وضاحت سے اجاگر ہوتے ہیں۔ انسانی تہذیب نے خوب سے خوب تر تلاش میں جو ارتقائی سفر طئے کیا اور جن وادیوں میں اور منزلوں سے یہ کاروان رنگ و بو گذرے۔ جب ان کے اس سفر کی تفصیل الفاظ کے پیکر اختیار کرتی ہے تو ''تاریخ'' بن جاتی ہے۔لیکن تاریخ ماضی کے واقعات کو صرف دہرانے ہی کا نام نہیں بلکہ ماضی کے بازیافت کا فن ہے۔ظاہر ہے کہ کچھ مخصوص افراد کے نام گنوا کر یا کچھ چیدہ چیدہ شخصیتوں کے

حالات لکھ کر عہد گذشتہ کو زندہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس کیلئے ضروری ہے کہ واقعات کے اسباب ونتائج کو گہری نظر سے دیکھا جائے اور اقوام وملل کی زندگی کی ان قدروں کا جائزہ لیا جائے جو اقوام کے عروج وزوال سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ مورخ کا کام صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ بیشتر مورخین کے بیانات کو ''باندازِ دگر'' پیش کردے۔ بلکہ اسے سیاسی، معاشی معاشرتی حالات کی فکری تجزیہ کی مدد سے اسباب وواقعات اور ان کے اثرات کی ایک ایسی تصویر پیش کرنی پڑتی ہے جو ماضی کے ہر پہلو کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔ تاریخ کا دیگر معاشرتی علوم سے بہت گہرا تعلق ہے۔ ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام معاشرتی علوم اور تاریخ سے ان کے تعلق پر گہری نظر رکھے۔

تاریخ نگاری کے فن کا جائزہ لیا جائے تو واضح طور پر نظر آئے گا کہ ابتداء میں تاریخ کا مفہوم یہ تھا کہ کچھ منتخب افراد کے کارہائے نمایاں بیان کردئے جائیں۔ کسی ملک کی تاریخ یوں لکھی جاتی تھی کہ وہاں کے سلاطین کا یکے بعد دیگر تذکرہ کردیا جاتا تھا اور حالات وواقعات اور ان کے اسباب ونتائج کے باہمی تعلق اور اجتماعی زندگی کی تصویر کشی کو بالکل نظر انداز کیا جاتا تھا۔ یہ انداز آگے چل کر نظر متروک ہوتا گیا اور تاریخ اجتماعی زندگی کی داستاں بنتی گئی رفتہ رفتہ یہ طریقہ کار تاریخ کے بارے میں عام ہوگیا۔ ہر مورخ نے اپنا نظریہ تاریخ جداگانہ طور پر بیان کیا ہے لیکن ایک حقیقت ان تمام نظریات کے پس پردہ کارفرما ہے۔ اگر تاریخ سچائی کے رخ سے نقاب نہیں اٹھاتی وہ محض داستاں طرازی ہے یعنی حقیقت کو تلاش کرنے کا جذبہ ہی تاریخ اور قصص وحکایات میں فرق پیدا کرتا ہے۔ ان تمام حالات کے ارتقاء پر فارسی کے چند معروف کتابوں کا میں نے اپنے اس مقالہ میں تعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔

بہمنی دور میں فارسی زبان میں تاریخ نویسی

شاہان بہمنیہ علمی سرپرستوں، سخاوتوں اور فیاضیوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی علمی قدردانی اور کمال پروری کا شہرہ سن کر عرب وعجم کے علماء شعرا اور مشائخ ان کے دربار میں چلے آتے تھے۔ چنانچہ بانی سلطنت سلطان علاء الدین حسن بہمنی نے صاحبان کمال کی تشویش کیلئے ''مزدقدم'' اور ''شست سر'' مقرر کیا تھا۔ یعنی اس کے زمانے میں جب کوئی صاحب کمال باہر سے آتا اس کو تین روز تک سرکار سے کھانا دیا جاتا اور پانچ ''ھون'' مزدقدم اور شست سر کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ محمد شاہ ثانی کے زمانے میں شعراء، علماء ایران، خراساں سے کھینچ کر ہندوستان آئے۔ چنانچہ حدائق سلاطین کے مصنف نے اس کے عہد میں ایک شاعر کا ذکر کیا ہے جو ایران سے گلبرگہ آیا اور میر فضل اللہ انجو کے توسل سے بازیاب ہوا اور ایک مدحیہ قصیدہ محمد شاہ ثانی کا دور زیادہ تر طبقاتی کشمکش میں گذرا۔ لیکن پھر بھی سلطنت بہمنیہ کے علمی وادبی ماحول کو رشن کیا۔ لیکن اس کے قبل کے بعد شعر وادب کی شمع اپنی آخری جھلک دکھا کر ختم ہوگئی۔ اسی طرح بہمنی دور میں چند شاعروں کے نام ملتے ہیں لیکن ان کے حالات اور نمونہ کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ اس زمانہ کی حیات ادبی کا ثبوت چند متاخر تاریخوں اور تذکروں کے منتشر بیانات سے ملتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین بہمنیہ کی اجتماعی زندگی ایران اثرات میں ڈوبی ہوئی تھی۔

بہمنیہ دور کی عظمت ''فتوح السلاطین اور بہمن نامہ سے قائم ہے جو اس دور کی منظوم تاریخ ہونے کے علاوہ ادبی شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں اور اب ان دونوں میں صرف ''فتوح السلاطین''، بہمنی دور کے شکار کی حیثیت سے باقی ہے۔

(1) عصامی : علاء الدبین حسن بہمنی شاہ کے عہد کے سب سے پہلے مصنف اور اپنے وقت کے سب سے بلند پایہ شاعر اور وسیع النظر مورخ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن فارسی کے قدیم

تذکرے ان کے بیان سے خالی ہیں۔ مولف برہان مآثر اور تاریخ فرشتہ کے مصنف نے ان کا ذکر کیا ہے لیکن دونوں نے ان کی کتاب کی اہمیت اور ان کے حالات قلمبند نہیں کئے ان کا پورا نام عبدالملک عصامی تھا۔ لیکن ان کے نام کے بارے میں بھی تذکرہ نگاروں کو اختلاف ہے۔ اس لئے کہ ۸ ویں اور ۹ ویں صدی ہجری میں عبدالملک عصامی نام کے ۲ تا ۳ اشخاص گذرے ہیں۔ جنہوں نے اپنے علم وفضل سے اپنے زمانے میں شہرت حاصل کی۔ لیکن خیال غالب یہی ہے کہ یہ ''فتوح السلاطین'' کے عبدالملک عصامی ہیں۔

تاریخ پیدائش کے بارے میں بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں۔ لیکن خود ان کے اپنے بیان ک مطابق جو انہوں نے ''فتوح السلاطین'' کے خاتمہ پر لکھا ہے یہ کتاب ۷۵۱ھ میں اتمام کو پہنچی اور اس وقت ان کی عمر ۴۰ سال تھی۔ جس سے ان کی تاریخ پیدائش ۷۱۱ھ مطابق ۱۳۶۰ء قرار پائی۔

فارسی کی تاریخ نویسی عادل شاہی دور میں

بساتین السلاطین

شاہان عادل شاہی بیجاپور کی تاریخ ۱۲۳۷ھ م ۱۸۲۴ء تک ہے۔ بساتین اسلاطین اس میں آٹھ فصلیں ہیں جو بوستان کہلاتی ہے۔ پہلی بوستان میں بانی سلطنت عادل شاہ کے حالات ۱۰۱۹ھ م ۱۵۱۳ء تک درج ہیں۔ دوسری بوستان سے ساتویں تک عادل شاہ کے جانشینوں کی تاریخ ۱۰۴۸ھ م ۱۶۳۸ء تک ہے اور آخر بوستان میں آخری تاجدار سکندر شاہ کے عہدہ حکومت کے حالات ہیں جس کے بعد عالمگیر نے بیجاپور پر قبضہ کرکے اپنی سلطنت کے ماتحت صوبہ بنالیا۔

عالمگیر کے زمانہ میں انگریزوں کے قبضہ تک جو واقعات گذرے ان کا تذکرہ اسی بوستان میں کرنے کے بعد مصنف نے تاریخ ختم کردی ہے۔ مصنف غلام مرتضی عرف حضرت صاحب' حضرت شاہ عبداللہ چشتی کے داماد تھے۔ ایک دوسرے نسخہ کے اعتبار سے اس تاریخ کے منصف محمد ابراہیم الزبیری ہیں لیکن یہ دعویٰ درست نہیں۔ یا ممکن ہے کہ محمد ابراہیم نے بھی کوئی تاریخ اسی نام کی مرتب کی ہو۔

تاریخ فرشتہ

گلشن ابراہیمی اور نورس نامہ کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔ اس تاریخ میں زمانہ قدیم سے ۱۰۲۳ھ م ۱۵۱۴ء تک کے حالات بیان کے گئے ہیں۔ کتاب مقدمہ۔ خاتمہ اور بارہ مقالوں پر مشتمل ہے۔

مقدمہ میں ہندوؤں کے عقائد اور قدیم راجاؤں کی عہد حکومت کو بیان کرنے کے بعد مسلمان فاتحین کی آمد کر تذکرہ ہے۔ پہلے مقالہ میں سلاطین غزنہ لاہور کے اور دوسرے میں سلاطین دہلی کے حالات ہیں۔ تیسرے لغاتیہ چھٹے مقالوں میں شاہان دکھن کے عہدہ حکومت کا بیان ہے۔ ساتویں میں سلاطین بنگالہ اور شاہان شرق کے حالات درج ہیں۔ آٹھویں مقالہ میں حکمرانان ٹھٹھہ اور ملتان کے اور نویں میں زمینداران سندھ کے دسویں میں ملابار کے حالات اور بارہویں مقالہ میں ہندوستان کے صوفیوں اور مشاہیر کا تذکرہ ہے۔

مصنف محمد قاسم ہندوشاہ فرشتہ (پیدائش استرآباد ۹۶۰ھ م ۱۵۵۲ء والد کا نام مولانا غلام علی ہندوشاہ' اوائل عمری میں مصنف اپنے والد کے ہمراہ مرتضی نظام شاہ اول کے عہد میں احمدنگر آیا۔ مولانا موصوف شاہزادہ حسین کے اتالیق مقرر ہوجانے کی وجہ سے احمدنگر میں آباد ہوگئے۔ مرتضی نظام شاہ اور ان کے جانشین مولانا کا بہت ادب واحترام کرتے رہے۔ مولانا کے انتقال کے بعد مصنف بیجاپور چلا آیا اور ابراہیم عادل شاہ بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل ہوگیا۔ بعدہ اپنے آقائے نامدار کے حکم سے تاریخ فرشتہ مرتب کرکے بادشاہ

مصوف کے نام کی رعایت سے تاریخ کا نام گلشن ابراہیمی رکھدیا۔اس تاریخ کا دوسرا نام ''نورس نامہ'' بھی ہے جو ابراہیم عادل شاہ کے محبوب ترین محل نورس بیگم کے نام پر رکھا گیا ہے۔

تاریخ کے تکملہ کے بعد ابراہیم عادل شاہ نے مصنف کو سفارت کی خدمت پر جہانگیر بادشاہ کے دربار میں بھیجا (۱۰۱۷ھ) وفات کے ٹھیک سنہ کا پتہ نہیں لیکن منصف ۱۰۳۳ھ تک زندہ تھا۔ یہ سال بہادر شاہ فاروقی کی وفات کا اور منصف نے اس بادشاہ کی سنہ وفات کا اندراج اپنے قلم سے کیا ہے۔مصنف تاریخ نویسی کے فرائض سے پورا آگاہ تھا اور اس کی مرتب کی ہوئی تاریخ کی بڑی صفت یہ ہے کہ تمام کتاب میں بادشاہ وقت کی تعریف میں ایک حرف بھی نہیں لکھا ہے۔ جب بادشاہ وقت کے ساتھ یہ برتاؤ تھا ''مرحوم'' بادشاہ کس شمار وقطار میں ہوں گے۔

قطب شاہی دور میں فارسی میں تاریخ نویسی

تاریخ سلطان محمد قطب شاہ

یہ کتاب خاندان قطب شاہی گولکنڈہ کی مستند تاریخ ہے۔جس میں سلطنت کے قیام کے سال ۹۲۵ھ م ۱۶۱۶ء تک کے حالات درج ہیں۔ ماہ شعبان ۱۰۶۶ھ میں ترتیب کا کام شروع ہوکر ۱۰۶۷ھ میں ختم ہوا۔مصنف نے خود دیباچہ میں لکھا ہے کہ سلطان قطب شاہ کے کسی پیشرو کے عہد میں ایک مفصل سگری معلوم تاریخ مرتب ہوئی تھی جس کے مصنف نے اپنے نام کو بھی ''یکے از چاکران ایں درگاہ'' کے پردہ میں مخفی رکھا۔موجودہ تاریخ آخر الذکر کا خلاصہ ہے۔سلطان محمد قطب شاہ ۱۷/ذیقعدہ ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء کو تخت نشین ہوا اور اس لئے موجودہ تاریخ میں اس کے پانچ سال کے عہد حکومت کے حالات درج ہوسکے۔ خاتمہ میں منصف لکھتا ہے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو اس سلطان کے عہد کی مکمل تاریخ مرتب کرکے شامل کرے گا۔لیکن ایسی تاریخ شامل نہ ہوسکی شاید مصنف کا انتقال سلطان کے عہد ہی میں ہوگیا اور اس لئے وہ اپنا وعدہ وفا نہ کرسکا۔

مقالہ اول میں بانی سلطنت قلی قطب الملک کے حالات ۹۵۰ھ م ۱۵۴۳ء درج ہیں۔مقالہ دوم میں سلطان جمشید قطب الملک کے حالات ان کی تخت نشینی سے وفات تک بیان کئے گئے (۹۵۷ھ م ۱۵۵۰ء) اس مقالہ میں ان کے لڑکے سبحان قلی کے بھی حالات ہیں جو چھ ماہ کی حکومت کے بعد معزول کردے گئے تھے۔مقالہ سوم میں ابراہیم قلی خان کے حالات میں جنہوں نے ۹۸۸ھ م انتقال کیا۔ مقالہ چہارم میں سلطان ابوالفتح محمد قطب کے حالات ہیں جو ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء میں فوت ہوئے۔خاتمہ میں ابوالمظفر ابوالمنصور محمد قطب شاہ کے حالات تخت نشینی سے ۱۰۱۵ھ م ۱۶۱۶ء تک درج ہیں۔اس تاریخ کے مصنف نے بھی اپنا نام ظاہر نہیں کیا اس لئے اس کے حالات میسر نہیں ہوئے۔

نظام شاہی دور میں فارسی زبان کی تاریخ نویسی

اس کے علاوہ ایک اور فارسی میں تاریخ نویسی کا کام جس کا نام برہان مآثر ہے جس کا مولف علی بن عزیز اللہ طباطبائی ہے اور جیسا کہ برہان مآثر کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولف قلی قطب شاہ کے عہد میں عراق سے دکن وارد ہوا تھا اور قلعہ نلدرگ کے محاصرہ میں محمد قلی قطب شاہ کے ساتھ تھا لیکن اس کے بعد قلی قطب شاہ کی ملازمت سے علیحدہ ہوکر شاہانہ احمد نگر کی ملازمت اختیار کی اور تاریخ برہان مآثر برہان نظام کے فرمائش میں لکھی ۔سنہ تالیف ۱۰۰۰ ہجری برہان مآثر کے اعداد برآمد ہوتا ہے۔مولف نے اس تاریخ کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔ طبقہ اول سلاطین گلبرگہ۔سلطان علاء الدین حسن شاہ گنگوئی بہمنی کے حالات سے شروع ہوتا ہے اور سلطان فیروز شاہ بہمنی پر ختم ہوتا ہے۔طبقہ دوم سلاطین بیدر۔سلطان احمد شاہ بہمنی سے شروع ہوکر سلطان محمود شاہ بہمنی پر ختم ہوتا ہے۔طبقہ سوم سلاطین احمد نگر۔ سلطان احمد شاہ بحری سے شروع ہوکر چاند سلطان پر ختم ہوتا ہے۔

صدام حسین۔ریسرچ اسکالر: شعبۂ اردو۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اردو نعت گوئی میں مولانا احمد رضا خاں کا مقام

نعتیہ شاعری کے حوالے سے مولانا احمد رضا خان کی خدمات اور امتیازات کیا ہیں اس کا تحقیقی جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے نعت کے فن، تصور نعت اور آداب نعت کو سمجھا جائے نیز اردو کے حوالے سے نعت گوئی کے آغاز وارتقاء کا مختصراً مطالعہ بھی کیا جائے۔

نعت گوئی کا فن:

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات والا صفات کی عظمت و رفعت کا بیان، آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ کی تعریف، آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ کا ذکر، آپ کے شمائل کا تذکرہ، آپ کے معجزات و کمالات کا بیان ابتدائے آفرینش سے جاری وساری ہے۔نعت گوئی کی تاریخ کو کسی زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا ۔البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نعت گوئی کا سلسلہ ازل سے شروع ہوا ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔آپ ﷺ کی آمد سے قبل بھی سابقہ آسمانی صحیفوں اور کتب میں آپکی آمد کی بشارتیں موجود ہیں اور آپکے اوصاف حمیدہ درج ہیں۔توریت ،زبور ،انجیل اور دیگر آسمانی کتب اور صحائف میں آپکے اوصاف وکمالات مذکور ہیں ۔خود رب قدیر نے قرآن مجید میں مختلف انداز میں آپ کی نعت بیان فرمائی ہے۔خود اہل عرب جو اپنے کو اہل لسان کہتے تھے اور جنہیں اپنی زبان دانی پر اس قدر ناز تھا کہ ماسوائے عرب کو عجمی کہتے تھے انہوں نے بھی حضور کی نعت میں بہت کچھ لکھا۔عربی ادب میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔صحابہء کرام حضور پر اپنی جان نثار کرتے اور نعت رسول ﷺ کو اپنا مقصد زندگی سمجھتے تھے۔دربار رسول ﷺ کے سب سے مشہور ومقبول شاعر حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب نعت پڑھتے تو انکا کلام سن کر سامعین کے قلب وجگر پر طاری ہونے والی کیفیت اور وارفتگی کا اظہار وبیان ناممکن ہے۔آپ ﷺ کے اصحاب کی تربیت ہی کچھ ایسی تھی کہ انہوں نے آپ ﷺ کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر آپ کے حسن وجمال، تعریف وتوصیف اور شمائل وخصائل میں طویل قصیدے اور ایسے اشعار بیان کئے کہ پڑھنے والا آج بھی انکی فصاحت وبلاغت اور حسن ادا کی داد دئے نہیں رہ سکتا۔مثال کے طور پر حضرت حسان رضی اللہ تعالی عنہ کے یہ اشعار دیکھیں:

واحسن منک لم ترقط عینی
واجمل منک لم تلد النساء
خلقت مبرءا من کل عیب
کانک قد خلقت کما تشاء

حضور ﷺ کی مدحت ،تعریف ،توصیف اور شمائل وخصائل کا نام نعت ہے۔نعت نظم میں بھی ہوسکتی ہے اور نثر میں بھی ۔لیکن بطور اصطلاح شعر ہی کے لئے استعمال کی جاتی ہے اور ایسی شاعری کو جس میں آپ ﷺ کی مدح وستائش کی گئی ہو نعتیہ شاعری کہتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ جب بھی نعت کا لفظ سامنے آتا ہے تو غیر ارادی طور پر قلب وذہن آپ ﷺ کے حسن وجمال میں شیفتہ و فریفتہ ہو جاتے ہیں۔نعت رسول روز اول ہی سے کائنات انسانی کی اپنے آقا ومولیٰ ﷺ سے قلبی وروحانی وابستگی کا مظہر بنی ہوئی ہے۔عالم اسلام کا کوئی خطہ، کوئی گوشہ، کوئی ملک اور کوئی زبان ایسی نہیں جس میں آپ ﷺ کی تعریف وتوصیف نہ کی جاتی ہو۔یہ واحد صنف سخن ہے جو شاعر کے کلام کو دوام عطا کرتی ہے اور مطلع

ہستی پر آفتاب کے ستاروں کی مانند ابھرتی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع ''قصیدہ بردہ کے اردو تراجم: تحقیق و تجزیہ'' کی پشت پر فن نعت اور نعت گوئی کی روایت کے متعلق لکھتے ہیں:

''نعت ایک اہم صنف ہے۔ نعت گوئی کا باقاعدہ آغاز تو حضرت ابوطالب نے کیا بعد میں اصحاب رسول نے بھی نعت گوئی کا سلسلہ شروع کیا جسکی توثیق خود پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے فرمائی۔ نعت گوئی کی روایت عہد صحابہ سے موجودہ عہد تک مسلسل قائم ہے۔ صرف تمام مسلم شعراء ہی نہیں بلکہ بہت سے غیر مسلم شعراء نے بھی آپ ﷺ کے فضائل و کمالات کا منظوم تذکرہ کر کے آپ فن کو اعتبار بخشا ہے۔''

مولانا احمد رضا خاں اور تصور نعت:

نعت گوئی ایک ایسا نازک فن ہے جسکی نزاکتوں کو پیش نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ حضور ﷺ کی تعریف و توصیف میں ادب و احترام، الفاظ کا انتخاب، خیالات اور مضامین کی پاکیزگی، اور منصب نبوت کا تقدس پیش نظر رکھنا لازمی ہے۔ نعت میں نہ تو اردو شاعری کی دیگر اصناف کے مانند بے جا مبالغہ اور غلو کی گنجائش ہے کہ عبدیت اور الوہیت کا فرق باقی نہ رہے او نہ اتنی تفریط کہ شان رسالت مآب میں تنقیص کا پہلو شامل ہو جائے۔ اس سلسلے میں مولانا احمد رضا خان لکھتے ہیں:

''حقیقتاً نعت شریف لکھنا بہت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر شاعر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے۔ جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں یک جانب کوئی حد نہیں اور نعت میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے''۔

نعتیہ شاعری کے لئے ضروری ہے کہ حقائق کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور اگر حقائق اور دلائل شاعرانہ ہوں تو ان کی تاویل نعت کے مناسب ہو ورنہ شاعرانہ حقائق سے بھی گریز کرنا چاہئے۔

نعتیہ شاعری میں نہ صرف شعر و سخن کی آزمائش ہوتی ہے بلکہ اس کسوٹی پر عقیدۂ توحید و رسالت اور عشق حقیقی کی پرکھ بھی بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔ اسی لئے ارباب سخن نے نعتیہ شاعری کو دودھاری تلوار سے تشبیہ دی ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی ترمیم و تنسیخ اور افراط و تفریط کا شائبہ ہو گیا تو سامان بخشش بننے کے بجائے طوق کفر و ضلالت بھی بن سکتا ہے جیسا کہ ایک شاعر لکھتا ہے:

میاں! یہ عشق ہے اور آگ کے قبیل سے ہے
کسی کو خاک بنائے کسی کو زر کر دے

ڈاکٹر ماجد دیوبندی یوں لکھتے ہیں:

ذکر رسول کر نہیں سکتے زبان سے
توفیق جب تلک نہ ملے آسمان سے

مشہور شاعر جگر مرادآبادی نعتیہ شاعری کی نزاکتوں کو یوں بیان کرتے ہیں:

اگر اللہ توفیق نہ دے انساں کے بس کا کام نہیں
پیغام محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں

نعت گوئی میں نہ صرف زبان دیکھی جاتی ہے اور نہ بیان پر نظر جاتی ہے، نہ فنی نکات تلاش کئے جاتے ہیں۔ اسکی روح صرف اور صرف اخلاص اور محبت رسول ﷺ ہے۔ نعت رسول ﷺ میں ''از دل خیزد بر دل ریزد'' والا معاملہ ہونا چاہئے۔ اور پھر یہ دل سے نکلی ہوئی بات اگر بارگاہ رسول ﷺ میں مقبول ہو جائے تو اشعار اور صاحب اشعار دونوں کو معراج حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ فارسی شاعری میں حافظ شیرازی، عطار نیشا پوری، جلال الدین رومی، سعدی شیرازی، عبدالرحمٰن جامی، سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، بوعلی شاہ قلندر، نظام الدین اولیاء، امیر خسرو وغیرہ کی نعتیں اسکی شہادت دے رہی ہیں۔

اردو میں نعت گوئی کا آغاز:

دیگر زبانوں کی طرح اردو شاعری کو بھی نعت گوئی میں ممتاز مقام حاصل ہے۔اردو شعراء نے اس صنف میں اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی:

''نعت گوئی،عشق رسول اور شوق مدینہ ہندوستانی شعراء کا محبوب موضوع رہا ہے اور فارسی شاعری کے بعد سب سے بہتر اور سب سے موثر نعتیں اردو ہی میں ملتی ہیں''۔

اردو میں نعت گوئی فارسی کے توسط سے آئی ہے ۔اردو کی دیگر اصناف کی طرح نعت گوئی کا آغاز بھی دکن سے ہوا ۔دکن کی قدیم مثنویاں اس کی شاندار مثال ہیں ۔ان مثنویوں میں جا بجا حمد کے ساتھ ساتھ عمدہ نعتیہ اشعار بھی خوب ملتے ہیں ۔نویں صدی ہجری سے لیکر گیارہویں صدی ہجری تک کی تمام دکنی مثنویوں میں نعت کا ایک شاندار ماضی ملتا ہے۔اور یہ سلسلہ دور قدیم سے آج تک چلا آرہا ہے۔دکن کے قدیم نعت نگاروں میں نظامی،خوب محمد چشتی،بحری،میراں جی،جانم،وجہی،نصرتی اور قلی قطب شاہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۷۰۰ء میں ولی اور پھر انکے دیوان کی شمالی ہند میں آمد اردو کے فال نیک ثابت ہوئی۔اس وقت شمالی ہند میں فارسی شاعری کا رواج تھا اور فارسی میں شاعری کرنا باعث افتخار سمجھا جاتا تھا۔لیکن ولی کے دیوان کی آمد نے یہاں کے ادبی حلقے میں ایک ہلچل مچادی اور کچھ ہی دنوں میں یہاں کے فارسی شعراء بھی ریختہ میں اشعار کہنے لگے۔دیوان ولی میں نظموں،غزلوں،گیتوں اور مثنویوں کے ساتھ ساتھ نعتیہ کلام کی مثالیں بھی خوب ملتی ہیں۔چنانچہ جہاں ایک طرف شعراء اردو غزل گوئی کی طرف مائل ہوئے وہیں نعت گوئی بھی انکی توجہ کا مرکز رہی۔

شمالی ہند کے ابتدائی نعت گو شعراء میں غالب،مومن ،ذوق،میر،درد،انشاء،انیس وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔کچھ آگے بڑھیں تو خواجہ الطاف حسین حالی اردو شاعری کے دور جدید کے اہم نعت گو شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں جن سے اردو میں نعت گوئی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔حالی کا نعتیہ کلام مقدار میں بہت کم ہے مگر معیار میں بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔انکے علاوہ جن شعراء نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے ان میں مشہور ومقبول امیر مینائی،محسن کاکوروی،اکبر الہ آبادی،شبلی نعمانی،جگر مرادآبادی،علامہ اقبال،فراق گورکھپوری،جوش ملیح آبادی،سیماب اکبر آبادی، داغ دہلوی،اصغر گونڈوی،فانی بدایونی، بیدل ،عمر خیام،میر عبد الحی دہلوی،آتش،ناسخ،جرأت ، تاباں،ریاض خیرآبادی ،شکیل بدایونی،اقبال سہیل،حفیظ جالندھری،دانش، وصل، عرش ملسیانی،کرشن پرشاد کول،نشتر جلیل، حسن رضا بریلوی،ظفر،ہادی،پیمی مارہروی،شکیل بدایونی،کافی مرادآبادی،ا مجد، منور،فیض احمد فیض،بیدم وارثی،ساحر لدھیانوی ،حسرت موہانی،مولانا احمد رضا خاں بریلوی،قتیل شفائی ،خمار بارہ بنکوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ تمام شعراء میں مولانا احمد رضا خان کا نام اس لئے سب سے اہم ہے کہ انہوں نے نعت گوئی کے فنی تقاضوں،اسکی نزاکتوں،لطافتوں،آداب اور باریکیوں کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے عمدہ،مؤثر،دلوں کو چھو جانے اور ایمان کو تازہ کردینے والی نعتیں لکھی ہیں ۔آپ کی تمام نعتیں آپ کے تصور نعت کی سچی مصداق ہیں ۔ان میں اعتدال،تناسب اور توازن ہے۔آپ کی نعتیں امتیازی مقام اور انفرادی شان رکھتی ہیں۔آپ بیک وقت مختلف علوم وفنون کے نہ صرف ماہر تھے بلکہ استاد فن کی حیثیت رکھتے تھے۔مختلف زبانوں مثلاً اردو،عربی،فارسی،ہندی،سنسکرت،سندھی وغیرہ میں کامل دسترس رکھتے تھے۔نعت گوئی کا سب سے اہم اور لازمی جزو عشق رسول اور ادب رسول ﷺ ہے اور آپ عشق و ادب رسول ﷺ کا سراپا مجسمہ تھے اور آپکا نعتیہ کلام قرآن وحدیث کی سچی تفسیر

ہے۔جسکا کھلا ثبوت آپکا نعتیہ دیوان حدائق بخشش ہے ۔گویا یہ دیوان اسم با مسمّٰی ہے اور دل میں عشق رسول ﷺ پیدا کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ چنانچہ مولانا احمد رضا خاں کے عشق رسول کو مولانا مختار احمد بہیڑوی یوں بیان کرتے ہیں:

عشق رسول جس کو مجسم ہو دیکھنا
آئے بریلی حضرت احمد رضا کے پاس

مولانا احمد رضا خان نے جس طرح تمام بحور میں اشعار نظم فرمائے ہیں اسی طرح آپکا یہ بھی کمال ہے کہ آپ نے قریب قریب شاعری کی تمام اقسام میں اشعار کہے ہیں اور فن شعر وادب کو اس انداز اسے نکھارا ہے کہ رہتی دنیا تک فن اور اہل فن آپکے مرہون منت رہیں گے۔

مولانا احمد رضا خان کے زمانے تک اردو شاعری محبوب کی زلفوں کی اسیر تھی۔محبوب کے لب ورخسار، قد وقامت اور زلف و ابرو کا ذکر شاعری کا لازمی حصہ تھے غرض اس دور میں عشق مجازی اتنا غالب آچکا تھا کہ شعر وادب کی اکثریت اسی دام فریب میں گرفتار تھی اور محبوب مجازی کے سراپا کا عاشقانہ بیان اور اسکی سوقیانہ تشریح ان کا طرہ امتیاز تھا۔عشق مجازی ذہن ودل پر اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ عشق حقیقی میں کی جانے والی شاعری پرانی وضع قطع کی ذہنیت کی تخلیق اور خشک عنوانی پر مشتمل شاعری سمجھی جاتی تھی۔مولانا احمد رضا خان کا اردو شاعری پر بے پناہ احسان ہے کہ اس غلط نظریہ کی تردید فرمائی اور اپنے حسن کلام، زور بیان اور حقیقت بیانی سے اردو شاعری کو زیب وزینت بخشی۔ساتھ ہی مذہبی شاعری میں اپنی رنگینی سخن سے رنگ ورس پیدا کردیا۔اور جس مذہبی عنوان کو شعراء خشک اور بے رنگ سمجھتے تھے اس کو اتنا رنگین اور حسین بنادیا کہ اس رنگ کے شعر کو بلند منصب اور اعلیٰ مقام حاصل ہونے لگا۔اردو شاعری کو عشق مصطفیٰ ﷺ کے رنگ میں ایسا رنگا کہ اردو شاعری کے چہرے کی زردی سرخی میں تبدیل ہوگئی اور اس بات کو ثابت کردیا کہ اردو شاعری کا حسن عشق مجازی اور دنیوی محبوب کے خدوخال کی تعریف میں نہیں بلکہ عشق خدا اور رسول اس کا اصلی جوہر اور حسن ہے۔ دیکھئے آپکے کلام میں ادب و تعظیم رسول ﷺ کس غایت درجہ کی ہے:

۱: سرور کہوں کہ مالک و مولیٰ کہوں تجھے
باغ خلیل کا گل زیبا کہوں تجھے
تیرے تو وصف عیب تناہی سے ہیں بری
حیراں ہوں میرے شاہ میں کیا کیا کہوں تجھے
لیکن رضاؔ نے ختم سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ خلق کا آقا کہوں تجھے

۲: تو ہے خورشید رسالت پیارے
چھپ گئے تیری ضیا میں تارے
انبیاء اور ہیں سب ماہ پارے
تجھ سے ہی نور لیا کرتے ہیں

۳: اپنے مولیٰ کی ہے بس شان عظیم
جانور بھی کریں جنکی تعظیم
سنگ کرتے ہیں ادب سے تسلیم
پیڑ سجدے میں گرا کرتے ہیں

نعت گوئی میں آپکا مقام نہ صرف اس لئے بلند وبالا ہے کہ آپ نے عشق حقیقی میں غرق ہوکر قرآن وحدیث کے مختلف مضامین وموضوعات کو نعت کا عملی جامہ پہنایا ہے بلکہ آپ کی نعتیہ شاعری اس میدان میں ایک بہترین رہنما کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور آج تک شعراء آپ کی نعتوں سے عشق حقیقی کے جذبات کو بیان کرنے کے آداب اور ہنر سیکھتے ہیں ۔آپ کی شاعری حق وصداقت پر مبنی ہے۔تصنع ومبالغہ آرائی، بیجا غلو، روایاتی تکلف، دروغ گوئی، کذب بیانی، جذبات کے سیلاب میں بہ جانا وغیرہ تمام طرح کے عیوب سے منزہ وپاک ہے۔خالق کائنات نے آپکو موزونیت ومعنویت کی وہ

صلاحیتیں دی تھیں کہ عشق رسول ﷺ کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ فن وادب کے اعتبار سے بھی آپ بے مثال تھے۔یہی وجہ ہے کہ آپکی شاعری میں آمد آمد کی بہار ہے اور آورد کا اس میں نام ونشان تک نہیں۔خود فرماتے ہیں:

''جب سرور عالم کی یاد تڑپاتی ہے تو میں نعتیہ اشعار سے بے قرار دل کو تسکین دیتا ہوں، ورنہ شعر وسخن میرا مذاق طبع نہیں''

اس قول سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ نے شاعری برائے شاعری نہیں کی بلکہ بطور عبادت اس صنف کو اپنایا ۔مدح رسول ﷺ آپکا مقصد اصلی تھا۔اور آپ کی شاعری نے لوگوں کے دلوں میں عشق رسول کی ایک نئی روح پھونکنے کا کام انجام دیا۔اس کا ثبوت حسب ذیل واقعہ ہے:

''ایک مرتبہ کوئی شاعر نعت رسول ﷺ لکھ کر آپکی خدمت میں بغرض اصلاح حاضر ہوئے۔انکے نعتیہ اشعار میں کچھ اس طرح تذکرہ تھا: یارسول اللہ! آپکی یاد اور آپکے فراق میں میرا یہ حال ہے کہ نہ راتوں کو نیند آتی ہے اور نہ دن کو سکون حاصل ہوتا ہے ۔آپ کے غم ہجر میں کھانا، پینا، سونا وغیرہ سب ترک ہو گیا ہے وغیرہ وغیرہ۔آپ نے ان اشعار کو دیکھ کر ان صاحب سے فرمایا اگر واقعی آپکی وہی حالت ہے جو آپ نے ان شعار میں بیان کی ہے تو آپکی یہ حالت قابل صد تحسین ہے اور اگر آپ کی حالت حقیقۃً وہ نہیں ہے جو آپ نے بیان کی ہے بلکہ شعر کو حسن اسلوبی سے آراستہ کرنے کے لئے محض شاعرانہ تکلفات کے تحت ہی آپ نے تصنع اور مبالغہ کے طور پر اپنی حالت بیان کی ہے اور آپکا حال اپنے بیان کے مطابق نہیں تو یہ ایک جھوٹ ہوا۔ذرا سوچو! جھوٹ اور وہ بھی اتنی عظیم بارگاہ میں؟ لہٰذا اپنے اشعار میں اپنی وہی کیفیت بیان کیجئے جو واقعی آپ محسوس کر رہے ہیں یعنی اپنے اشعار کو حق وصداقت پر ہی محمول کریں''۔(حدائق بخشش حصہ سوم مرتبہ مولانا محبوب علی خاں: مقدمہ از محبوب علی خاں صفحہ نمبر ۸)

فیُوّم خالد (شکاگو۔امریکہ)

ایک لڑکی تنہا سی

ایک لڑکی تنہا سی
جانے کیوں اتنے دکھ سہتی ہے

چہرے مہرے سے تو
شاد وآباد لگتی ہے
پھر بھی جانے کیوں
گزرے موسموں کے دکھ
اسکا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں
آنکھوں میں کرب کا جل بن کر رہتا ہے
رخساروں پر بہتے آنسو
ہونٹوں پر پھیکی سی مسکان لئے
ہاتھوں میں ساتھی کا ہاتھ لئے
وہ قریہ قریہ گھوما کرتی ہے
جانے کس کو ڈھونڈا کرتی ہے۔

ایک لڑکی تنہا سی
جانے کیوں اتنے دکھ سہتی ہے

شمیم مشتاق۔ پورہ معروف مئواتر پردیش

سیاست اور طلبا

سیاست ایک ایسا کھیل ہے، جس میں ہر شخص شعوری اور لاشعوری طور پر نہ چاہتے ہوئے بھی ملوث ہو ہی جاتا ہے۔ کیونکہ سیاست سے انسان کا بڑا گہرا تعلق ہے اور یہ تعلق کوئی خاص لوگوں کا کھیل نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنے اپنے طور سے اس کھیل کو کھیلتا ہے ۔ سیاست ایک ایسا موضوع ہے کہ جس میں ہر کس ناکس چائے کی چسکی کے ساتھ بحث ومباحثہ کرتا رہتا ہے اور ایسا کیوں نہ ہو، اس لیے کہ سیاست کے ذریعہ لوگ اپنے حقوق سے آشنا ہوتے ہیں اور سیاست کی حقانیت سے واقف ہوتے ہیں۔ اس بیداری کے تئیں اپنے حق کی بازیابی کے لیے مختلف راستوں کو اختیار کر کے حقوق حاصل کرتے ہیں۔

سیاست کے ہزار رنگ ہیں اور یہ بھی ہے کہ اس کا کوئی مخصوص ومتعین مقام نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ تو ہر جگہ اور مقام میں پائی جاتی ہے۔ یہ بنجاروں کے مانند، تو کبھی غم کا لبادہ اوڑھ کے کسی کے گھر میں ڈیرا ڈال دیتی ہے، تو کبھی کسی کالج ویونیورسٹی میں، کبھی کسی شہر کے اندر، تو کبھی کسی ملک کے اندر، گرچہ اس کا کوئی مخصوص ٹھکانہ نہیں ہے لیکن یہ انسانوں کے دل میں بستی ہے اور انسانوں کو اپنا مرید بنا کر ان کے دلوں پر راج کرتی ہے۔ بعض مرتبہ تو ایسا لگتا ہے کہ سیاست لوگوں کے دلوں کی دھڑکن ناپنے کا آلہ ہے کیونکہ جب سیاست کا بازار گرم ہوتا ہے تو اس وقت لوگ اپنے رہنما اور لیڈر کی کشتی کو پار لگانے کے لیے مرنے اور کٹنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیڈر ذات پات، ہندو مسلم اور مسجد مندر کے نام پر سیاست کرنے لگتے ہیں اور سیاست کو اپنے گھر کی لونڈی اور عوام کو اپنے پیر کی جوتی سمجھ کر ان کو بیوقوف بناتے ہیں۔

بہر حال انسان کی زندگی کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ انسان کے پیدا ہوتے ہی سیاست شروع ہو جاتی ہے کیونکہ ماں باپ بچوں کی پرورش وپرداخت کر کے ان کے مستقبل کو سنوارنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں تا کہ بچے کامیاب وکامران ہو کر ماں باپ کے بڑھاپے کی لاٹھی اور سہارا بن سکیں، یہ بھی ایک طرح کی سیاست ہے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ سیاست انسان کے لیے ایک غذا کی حیثیت رکھتی ہے اور جب سیاست سے انسان کا اتنا گہرا تعلق ہے تو طلبا اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ طلبا مستقبل کے سپاہی ہیں، ملک کی ترقی میں ان کا ایک اہم رول ہے، اپنی تعلیم کے ساتھ کبھی کبھی وہ سڑکوں پر اتر کر لوگوں کے لیے انصاف کا نعرہ بلند کرتے ہیں، حکومت سے سوال کرتے ہیں، مظلوم ومجبور انسان کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، جس کی پاداش میں حکومت ان کے ساتھ زیادتیاں بھی کرتی ہے۔

گذشتہ چند سالوں سے ملکی حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حکومت طلبا کو ڈرا دھمکا کر ان کو کلاس کے اندر مقید کرنا چاہتی ہے۔ کیونکہ حکومت کو ڈر ہے کہ آج کے طالب علموں کا سڑکوں پر اترنا کہیں جے پی آندولن کی طرح انقلاب کی صورت اختیار نہ کر جائے، اس لیے حکومت مختلف پروپیگنڈے کے ذریعہ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتی ہے کہ طلبا کا کام کالج ویونیورسٹی میں سیاست نہیں بلکہ پڑھائی کرنا ہے، یہ بات درست ہے کہ ایک طالب علم کا کام سیاست نہیں بلکہ پڑھائی ہے، مگر جب طلبا کے حق کو چھیننے کی کوشش کی جائے گی تو ان کا کام پڑھنے کے ساتھ سیاست بھی ہو جاتا ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں جب بھی طلبا کے ساتھ

زیادتی کی گئی ہے تو طلبا نے حکومت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے اور حق وناحق کے درمیان ایسا سیاسی انقلاب برپا کر دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوگیا، چاہے وہ امریکہ کو آزاد کرانے میں ابراہیم لنکن کا سیاسی انقلاب ہو یا مارٹھن لوتھر کی آزادنہ سوچ، یا پھر ایران میں انقلاب کی فضا ہموار کرنا ہو۔ انہیں طلبا کی کوششوں اور ان کی سیاسی سوجھ بوجھ سے آج یہ ممالک دنیا میں ترقی یافتہ ممالک میں شمار ہوتے ہیں۔ انہیں طلبا ہی کی دین ہے کہ ملک ہندستان میں برسوں سے پھیلی سماج میں چھوا چھوت کی بیماری اور جاگیردارانہ نظام کو اکھاڑ پھینکا اور جمہوریت کو قائم کیا۔ مگر آج اسی جمہوریت کی بقا کے لیے طلبا سڑکوں پر ہیں تو انہیں حکومت مخالف بتا کر ان کے سیاسی شعور کو ختم کر کے کتابوں اور کلاسوں کے اندر مقید کرنا چاہتی ہے جو کہ پڑھائی کے بالکل برعکس ہے۔

میرا سوال ان لوگوں سے ہے جو طالب علم کو سیاست سے دور رکھنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ آخر تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے؟ کیا پڑھائی کا مطلب صرف علم حاصل کرنا ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ پڑھائی دراصل حق وناحق کے درمیان ایک جنگ ہے، تعلیم بے قصوروں، مجبوروں اور دبے کچلے لوگوں کو قومی دھارے سے جوڑنے کا نام ہے۔ تعلیم ذات پات سے اوپر اٹھ کر سب کو انصاف کے راستے پر گامزن کرنے کا ذریعہ ہے۔ اسی لیے اکثر وبیشتر یونیورسٹیوں میں یہ نعرہ لگایا جاتا ہے کہ لڑو پڑھائی کرنے کو۔ پڑھو سماج بدلنے کو۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ طالب علم سیاست اپنی پڑھائی کے لیے کرتا ہے۔ مجبوروں کو ان کا حق دلانے کے لیے آواز اٹھاتا ہے، تو ان کی جدوجہد کو سیاست کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر حکومت کی نظر میں حق کی بازیابی کے لیے آواز اٹھانا، مجبوروں کو حق دلانا، دبے کچلے لوگوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کا نام سیاست ہے تو ہم فخر سے اس سیاست کو کرتے رہیں گے۔

ایک طالب علم تعلیم کے ذریعہ حق وباطل کے درمیان فرق کرتا ہے اور ان کو ہمیشہ یہی سکھایا جاتا ہے کہ حق کے لیے آواز اٹھاتے رہنا چاہئے، چاہے ماحول سازگار نہ یا نہ ہو، کیونکہ ہمیشہ حق اور سچ کی ہی جیت ہوتی ہے اور باطل کو منہ کی کھانی پڑتی ہے۔ لہٰذا طلبا کو چاہئے کہ ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پیش نظر تعلیم کے ساتھ اپنے سیاسی شعور کو بیدار رکھیں اور ملک کی ترقی اور بہتری کے لیے کمربستہ ہوں، تاکہ ایک نئی اور پاکیزہ سیاست وجود میں آسکے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ تعلیم یافتہ اور ایماندار ہوں، ورنہ پھر وہی ہوگا کہ تعلیم سے بے بہرہ انسان وزیراعظم اور وزیر تعلیم بن کر ہمارے اوپر حکومت کریں گے۔

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC

Consultation Time
Morning:9:00 am to 3:00 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

سیدہ زہرا جبین۔حیدرآباد

تقدیر میں ہوتو...

"آج عروج کے تایا ابّو کی فیملی آئی تھی .. نبیلہ کچھ عرصے میں اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ جانے والی ہے ہم سمجھے اسلئے سب اکھٹے ہی ملنے چلے آئے . میٹھائی کی ٹوکریاں اور پھول لئے ... وہ لوگ تو پوری تیاری سے آئے تھے . آتے ہی بھابھی نے عروج کو مانگ لیا کاشف کے لئے . بس کھڑے کھڑے ہی اسے انگوٹھی پہنا کر چلے گئے". عروج کی امی نے تفصیل سے کہا.

"تمہاری منگنی بھی ہوگئی اور مجھے خبر تک نہیں؟" وہ کچھ دیر پہلے ریان سے ہونے والی گفتگو بھلائے عروج کو گھور رہی تھی.

"ارے بیٹا بھابھی نے تو ہمیں بھنک بھی نہیں لگنے دی. سیدھے آئیں اور انگوٹھی ڈال دی . ہم نے بھی اعتراض نہیں کیا . ایک عرصے سے بات تو طے ہی تھی". وہ مسکرا کر کہنے لگیں.

سنایا نے بھی عروج کو مٹھائی کھلا کر مبارکباد دی . عروج اسے لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی . سنایا کا دل نہیں چاہا کہ وہ اس خوشی کے موقع پر کوئی رنجیدہ بات کرے سو وہ کچھ دیر بیٹھ کر گھر چلی گئی.

عروج اب شادی کی شوپنگ کرنے میں لگی ہوئی تھی. ایک دن وہ سنایا کے گھر چلی آئی اور اسے بھی شوپنگ پر ساتھ چلنے کے لئے اسرار کرنے لگی . پر اس نے منع کر دیا . اس نے کریدا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی.

"وہ مجھے بیوقوف بناتا رہا اور میں بنتی رہی . وہ مجھے دھوکہ دیتا رہا عروج . میرے جذباتوں کے ساتھ کھیلتا رہا . کالیج میں جب اس نے مجھے پروپوز کیا تھا تب بھی مجھے ذلت اٹھانی پڑی . وقت کے ساتھ ساتھ میں سمجھتی تھی کی کم عمری اور لاشعوری میں اس نے مجھے پروپوز کیا تھا . میں نے ریان کے لئے اپنی رائے بدل دی تھی، گزرتے وقت کے ساتھ . پر اس نے تو میرا مذاق ہی بنا دیا . تم اس کی تائید کر رہی تھی نہ عروج . دیکھو اس نے کیسا کھیل کھیلا میرے ساتھ". اس نے عروج کو سب بتا دیا.

"مجھے ریان بھائی سے یہ امید نہیں تھی". وہ اسے کوستی وہاں سے چلی گئی.

ایک شام وہ نڈھال اپنے کمرے میں لیٹی ہی تھی کی ممی آ گئیں .

" کتنی کمزور ہوگئی ہے میری بچی . کیا حال بنا لیا ہے اپنا؟" وہ اس کے مرجھاتے چہرے کو دیکھ رہیں تھیں.

"میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا ہے". وہ چھت پر نظریں جمائے کہنے لگی.

"ایک رشتہ ٹوٹنے سے کیا ہوتا ہے؟ میں جانتی تھی تمہیں تکلیف ہوگی . اس لیے میں نے ثانیہ کو منع کیا تھا تمھیں بتانے سے. پر اس لڑکی کے منہ میں کوئی بات ٹکے تب نا". وہ تو ریان کے دیے ہوئے زخموں کی وجہ سے ٹوٹ گئی تھی .

" کیا کہا ہوگا ریان نے-" وہ سوچ رہی تھی۔

"پہلے تو ایسا کچھ نہیں کہا تھا ان لوگوں نے . دو دن پہلے لڑکے کی والدہ کا فون آیا تھا . اب اگر ان کا لڑکا امریکہ جا رہا ہے وہ بھی یہ بتائے بغیر کہ کتنے وقت کے لئے تو کون راضی ہوگا اپنی بیٹی اس لڑکے سے منسوب کرنے کے لئے . اس لئے ہم نے منع کر دیا. پر لوگ اچھے تھے تبھی تو ان لوگوں نے سب کچھ سچ بتا دیا" . ممی تفصیل سے بتا رہی تھیں . ان کی باتیں سن کر نہ جانے کیوں وہ اور بھی بے چین ہوگی.

اکثر اسے کام کرتے وقت اسے ممی کی بات یاد آتی .

'لڑکا امریکہ جارہا ہے کتنے وقت کے لئے یہ بتائے بغیر'.

"ہوں امریکہ جائے، یا جہنم میں ... میری بلا سے" وہ سر جھٹکتی . عروج کو اس نے بتادیا تھا کی وہ امریکہ جارہا ہے . وہ بھی سن کر خوش ہی ہوئی تھی . لیکن اس کی وحشت وقت کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی . اور یہ بات عروج نوٹ کررہی تھی.

"اب تو تم خوش ہونا؟ جیسا تم چاہتی تھی بالکل ویسا ہی ہورہا ہے؟" عروج نے ایک دن فون پر سوال کیا . اس کا انداز اسے اندر تک سلگا گیا پر وہ خود اپنی کیفیت سے بے خبر تھی.

"میں خوش ہوں". اس نے ہم کلامی کی اور فون بند کردیا.

"بولو نہ یار مجھے مس کروگی؟" اسے کہیں سے آواز آئی پر کمرے میں کوئی نہیں تھا . اس نے ایک دفع رات کے دو بجے اسے سوال کیا تھا، جو آج اس کی کانوں میں گونج رہا تھا.

"نہیں میں تمہیں ہرگز مس نہیں کرتی". اس نے خود سے کہا .

"سنایا تم خوش نہیں ہو؟ تم اس غلطی کی سزا صرف ریان بھائی کو نہیں دے رہی ہو، خود کو بھی دے رہی ہو . انہوں نے جو کیا غلط کیا، پر تم جو کررہی ہو وہ بھی صحیح نہیں ہے".

گزرتے وقت کے ساتھ اس کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی . اس کی نظروں کے سامنے ریان کا چہرہ گھومتا وہی اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا.

اوپر سے ثانیہ اٹھتے بیٹھتے آہیں بھرتی" . ہائے! اتنے اچھے تو تھے ریان بھائی" . اور وہ اندر تک سلگ جاتی اور اسے گھر کتی.

ایک دن تو حد ہی ہوگئی . وہ حیران ہوئے بنا نہیں رہ سکی، جب ممی نے بھی سرد آہ بھری". لڑکا تو بہت پسند آیا تھا مجھے تمہارے لئے . کتنا وجیہ اور سلجھا ہوا تو تھا وہ . پر کیا کریں قسمت میں نہیں تھا . ایک بات تو ہے وہ جس کی بھی تقدیر میں ہوگا وہ لڑکی بہت خوش نصیب ہوگی". ایک چبھن سی ہوئی تھی دل میں.

"تمہارا نام تو ساحر ہونا چاہیے تھا . سب کو اپنے سحر میں لے لیا تم نے". وہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی تھی-

رات کے کھانے کے بعد وہ برتن سمیٹ کر اپنے کمرے میں چلی آئی . وہ اندر آئی ہی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا . اس وقت کون ہوسکتا ہے۔

"میں ردا بول رہی ہوں . ریان کی چھوٹی بہن". اس نے تعارف کرایا.

"جی کہیں؟" وہ حیران ہی تو تھی اس کے کال کرنے پر.

"بھائی نے مجھے سب بتادیا ہے . میں جانتی ہوں بھائی نے جو کیا وہ صحیح نہیں تھا . پر یہ بھی سچ ہے کی وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں . آپ ان کے لئے اتنی اہم ہیں کہ آپ کی ایک التجا پر وہ سب کچھ چھوڑ کر جارہے ہیں . اگر ان کے دل میں کھوٹ ہوتا تو وہ آپ کو کبھی سچائی نہیں بتاتے . غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے . اور وہ اپنی غلطی پر نادم ہیں انجانے میں ہی سہی لیکن آپ بھی تو ان سے محبت کرنے لگیں تھیں ... وہ کل جارہے ہیں کبھی نہ آنے کے لئے".

ردا اپنی ہی باتیں کرتی فون بند کرچکی تھی . لیکن اس کے آخری جملے پر سنایا کو ایسے لگا جیسے کسی نے اس کا دل اپنی مٹھی میں بھینچ لیا ہو . اسے سانس لینا مشکل لگ رہا تھا . وہ اپنے فیصلے سے مطمئن کب تھی . جو ہوا تھا اسے درگزر کرنا مشکل تھا، لیکن ناممکن نہیں . پہلی بار اپنی انا کو خاطر میں لائے بغیر اپنے دل کی سنی تھی اس نے، اس نے ریان کو کال کیا.

وہ پیکنگ میں مصروف تھا جب اس کا موبائل بج اٹھا' . ممی، ثانیہ، عروج، سب اسے پسند کرتے ہیں تو ضرور اس میں کوئی اچھائی ہوگی'. وہ سوچتی ہوئی فون ریسیو ہونے کی منتظر تھی .

"السلام علیکم" سنایا نے پہل کی.

"وعلیکم السلام ... کیسی ہو سنایا؟" بہت ہی کمزور لہجہ تھا.

"میں ٹھیک ہوں . آپ امریکہ جارہے ہیں؟" اس نے سوال کیا.

"ہاں صبح پانچ بجے کی فلائٹ ہے". دونوں طرف خاموشی چھا گئی .

"اب تم اپنی زندگی ایک نئے سرے سے شروع کرسکتی ہو. پچھلی باتوں کو ایک برا خواب سمجھ کر بھول جاؤ . اور ہو سکے تو"... ریان کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کی وہ پھٹ پڑی.

" کیوں؟ ہر دفع میں ہی کیوں بھول جاؤں؟ ریان آپ عجیب شخص ہیں . پہلے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور جب میں اقرار کرنا چاہوں تو کتنی آسانی سے کہہ دیتے ہیں' . سنایا میری باتوں کو بھول جاؤ ..'اتنی ہی ہمّت تھی؟ اس بار آپ میری باتوں کو بھول جائیں". وہ اپنے پہلے والے انداز میں اسے آڑھے ہاتھ لینے لگی.

"تمہاری کونسی بات کو بھول جاؤں؟" وہ اس اچانک ردعمل کے لئے بالکل تیار نہیں تھا . سونا سمجھی سے پوچھنے لگا.

"میں نے جو شادی سے انکار کرنے کو کہا تھا اسے بھول جائیں" وہ پُر اعتماد تھی آج۔

" میں آپ کو بہت مس کر رہی ہوں " وہ مسکرانے لگی اسے ایک سکون محسوس ہو رہا تھا.

"اگر ایسا ہے تو ... تو سنایا میں کل ہی ماما کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں . اب ہمارے گھر والے ہی کچھ اچھا فیصلہ کرینگے . میں نہیں چاہتا کی تم مجھے اور زیادہ مس کرو". ریان خوشی سے جھوم رہا تھا..

"میں انتظار کرونگی ... جانتے ہو ریان میری انا مجھے بہت پیاری ہے اگر اس وقت ہمارے لیکچرر نے مجھے آپ کے ساتھ نہیں دیکھا ہوتا تو شاید میرا ردعمل کچھ مختلف ہوتا . اور جب پتا چلا آپ ہی کا پروپوزل میرے لئے آیا ہے تو ایسے لگا جیسے آپ مجھ سے پرانی بات کا بدلہ لے رہے ہیں . مجھے اپنی شکست منظور نہیں تھی . پر میں یہ بھول گئی تھی کی ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو . یہ سب تقدیر کا کھیل تھا جو میں نہیں سمجھ سکی . اور دانش والی بات پر تو ایسے لگا کہ آپ اپنے فائدے کے لئے مجھے دھوکا دیتے رہے . میں آپ کو ہر حال میں ہارا ہوا دیکھنا چاہتی تھی . اسلئے میں نے آپ کو اس رشتے سے انکار کرنے کے لئے کہہ دیا . میں سمجھی یہ آپ کے لئے سزا ہوگی . پر اصل میں میں خود کو سزا دے رہی تھی" .... یہ سب کہہ کر آج وہ اپنے سر سے ایک بوجھ اترتا محسوس کر رہی تھی.

" سنایا میں تقدیر پر یقین کرتا ہوں . مجھے پورا یقین تھا کہ اگر تم میری تقدیر میں ہو تو مجھے ضرور ملوگی".

ردا جو بھائی کے کمرے میں آرہی تھی، سنایا کا نام سن کر باہر ہی رک گئی۔

."ویسے میں نہ کہتا تھا کہ تم ڈرنا بند کردوگی تو آدھے مسئلے حل ہوجائینگے . آج تو یقین ہوگیا ہوگا؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا.

"میں کسی سے نہیں ڈرتی". وہ چیخ ہی تو پڑی تھی . ادھر ریان کا زوردار قہقہہ گونجا . ردا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی . وہ اندر چلی آئی.

"اہم اہم ... بھائی"... با آواز بلند کہہ کر وہ آنکھوں میں شرارت لئے دروازے سے ٹیک لگا کر ٹھہر گئی.

"میں بعد میں کال کرتا ہوں". اس نے سنایا سے کہہ کر فون بند کردیا . سنایا نے ردا کی آواز سن لی تھی . اب وہ صبح کی منتظر تھی . ایک نئی صبح جو اپنے ساتھ خوشیوں کی نوید لانے والی تھی.

" کچھ پیکنگ رہتی ہے تو مجھے کہیں". وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے فون کا اثر ہوگیا ہے . اپنی مسکراہٹ چھپاتی ہوئی ردا نے دریافت کیا .

"پیکنگ؟ کون سی پیکنگ، میں کہاں جارہا ہوں؟" وہ اپنا سامان ان پیک کرنے لگا..

" کل ماما کے ساتھ تم بھی چلی جانا سنایا کے گھر". قدرے اطمینان سے کہا.

"سنایا؟ کون سنایا؟ اور ہم کیوں جائیں ان کے گھر؟" وہ بھی اسی کی بہن تھی . بھائی کے کچھ دیر قبل والے انداز کی اس نے نقل اتاری.

اس کے جواب پر ریان نے ادھر ادھر نظریں گھمائی . کچھ نہ ملنے پر اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا پانی کا بوتل اٹھالیا . وہ بوتل ردا پر اچھالنے ہی والا تھا کہ وہ بھائی کا ارادہ بھانپ کر تقریباً چیختی ہوئی بھاگ کھڑی ہوئی" . ماما! بھائی شادی کے لئے راضی ہوگئے ہیں". ریان کے لبوں پر متبسم مسکراہٹ دوڑ گئی۔

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدرآباد
Regd No: 180/2016

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام: شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.............................گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ۔ تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔ اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵ر جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہو جائیں۔ اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔ جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ ٹرسٹیوں کے مشورے سے دوسو (200) رگز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جا رہی ہے، جس کی مجموعی قیمت 24ر لاکھ روپے ہے، فی گز 12ر ہزار روپئے ہے۔ 10ر لاکھ روپئے بطور بیع نامہ ادا کیا گیا ہے۔ اس زمین پر مصلیٰ، مدرسہ، لائبریری، دفتر اور ایک آڈیٹوریم بنانے کا ارادہ ہے۔ اس لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے اور مرحومین کے صدقہ جاریہ کے لیے تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔

Bank : IDBI CURRENT ACCOUNT
A/c Number : 1327104000065876
A/c Name : Shibli International Educational and Charitable
IFSC Code: IBKL0001327, Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا اچیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**